روحِ اسلام

ڈاکٹر رفیع الدین

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

رُوحِ اسلام

ڈاکٹر رفیع الدّین

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

۷۔ فرینڈز کالونی، سمن آباد، لاہور

نام کتاب ________ روح اسلام

نام مصنف ________ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ناشر ________ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

پرنٹرز ________ میٹرو پرنٹرز لاہور

تعداد ________ ۳۰۰۰

باراول ________ جون ۱۹۹۳ء

قیمت ________ ● روپے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط

(الآیۃ)

"ایمان رکھنے والے لوگ اللہ سے
شدید محبت رکھتے ہیں"

(البقرہ ۱۶۵

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

(اقبال)

تعارف

اہل ایمان میں سے جو لوگ قلب سلیم رکھتے ہیں' انہیں اسلام کی حقانیت میں یقین افروزی کے لئے زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں پڑتی' تاہم اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اطمینان قلب کے لئے اللہ تعالیٰ سے دلیل و برہان کا تقاضا کر سکتے ہیں تو ایک عام آدمی کے لئے بھی براہین و استدلال یقیناً ایزادی ایمان کا باعث بن سکتے ہیں۔ مغربی علوم و افکار کی یلغار نے ہماری نوجوان نسل میں جو شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں ان کے ازالے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ دور کی علمی سطح کے مطابق حکیمانہ اسلوب اختیار کر کے ان کے ایمان کی آبیاری کی جائے۔ تبلیغ اسلام کا یہ حکیمانہ طریق کار ہی الحاد و لادینیت کے موجودہ پرفتن دور میں نوجوانوں کے دلوں کو اس نور سے مستنیر رکھتا ہے جسے کفر کی پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔ بیسویں صدی میں جن شخصیات نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں' ان میں عوامی سطح پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور علمی سطح پر ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہی تین رجال اس صدی کے بہترین مبلغین اسلام شمار ہوتے ہیں۔

دور حاضر میں لوگوں کے پاس طویل تحریریں پڑھنے کے لئے وقت نہیں رہا اس لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کے اس مختصر مقالے کو شائع کر کے زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے نوجوانوں تک پہنچایا جائے جو آج سے چالیس سال پیشتر "روح اسلام" کے عنوان سے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے شائع کردہ مجموعہ مضامین "اسلام کی بنیادی حقیقتیں" میں چھپا تھا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۵۳-۱۹۵۰ء کے دوران شائع ہوا جب ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم اس ادارے میں ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز تھے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جس سے یہ تحریر افادہ عام کے لئے اخذ کی گئی ہے۔

روح اسلام اگرچہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی ابتدائی تحریروں میں سے ہے لیکن اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے فلسفے کا خلاصہ مختصر الفاظ میں سمٹ آیا ہے۔ یہ فلسفہ ڈاکٹر رفیع الدین کے اپنے قول کے مطابق علامہ اقبال" کے فلسفہ خودی ہی کی توضیح ہے۔ لیکن جرمن سکالر وارن سٹین کرس (Warren Steinkrus) نے اسے الگ طور پر داعیہ الی العین (Urge for Ideals) کا نام دیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ فلسفہ اتنی عام فہم زبان میں بیان ہوا ہے جسے ایک عام آدمی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی تحریر ہے جو قلوب کو طمانیت و سکینت سے ہمکنار کر کے انہیں رسوخ فی الایمان کی نعمت سے مالامال کرتی ہے۔

مظفر حسین
اکیڈیمک اینڈ ایڈ منسٹریٹو ڈائریکٹر
آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس

روح اسلام

اگر اسلام کی ایک مختصر اور عام فہم تعریف کی جائے، تو کہا جائے گا کہ انبیاء کی تعلیم کا نام اسلام ہے۔ یہ تعلیم سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ پہلے اور آخری نبی کے درمیان لاتعداد پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ایک روایت میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ کوئی قوم اور کوئی بستی ایسی نہیں جس میں ایک پیغمبر نہ بھیجا گیا ہو--- **وان من قریتہ الاخلا فیھا نذیر** (کوئی بستی ایسی نہیں جس میں ایک نبی نہ آیا ہو۔) **وان من امتہ الاخلا فیھا نذیر** (کوئی امت ایسی نہیں جس میں ایک نبی نہ آیا ہو۔)

ان سب انبیاء کی تعلیم اپنی اصل یا بنیاد کے لحاظ سے ایک ہی تھی، اس لئے ہر نبی تمام پہلے انبیاء کی تعلیم کی تائید اور توثیق کرتا رہا ہے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص گزشتہ انبیاء میں سے ایک نبی کی تعلیم کا بھی منکر ہے، وہ گویا اس کا بھی منکر ہے اور مسلمان ہی نہیں۔ **لانفرق بین احد من رسلہ ونحن لہ مسلمون۔** (ہم اس کے نبیوں میں کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے۔) **یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔** (وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کیا گیا اور اس پر جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔)

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحصل یا روح یا نچوڑ کیا تھا، تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ "محبت"... اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے--- ایسی محبت کی تعلیم، جو خالص بے لاگ اور بے غرض ہو، جو دائمی اور لازوال ہو، جو اپنے کمال کی طرف ہمیشہ بڑھتی رہے اور جس میں کمی یا مایوسی کا قطعاً" کوئی امکان موجود نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ قدرت کو اس تکلف کی ضرورت کیا تھی، اس نے کیوں انسان کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا اور کیوں پے در پے انبیاء بھیجے تاکہ انسان کو ایک خالص، کامل اور لازوال محبت کی تعلیم دیں؟ اس کی وجہ نہایت معقول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس قسم کی محبت کی پیاسی ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اس قسم کی محبت کے لئے بے قرار ہے، تڑپ رہا ہے۔ وہ ہر آن اور ہر لحہ اس قسم کی محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی اسی کی تلاش کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، بڑی ہلاکت خیز مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن اس کی تلاش نہیں چھوڑتا.... کیوں کہ چھوڑ ہی نہیں سکتا، یہ محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے محبوب کی تلاش کرے جو اس کی فطرت کے تقاضائے محبت کو بہ تمام و کمال پورا کر سکے،

جسے وہ دل و جان سے چاہے اور جس سے الفت کرے۔

پہلے انسان سے لے کر آج تک نوع بشر کی ساری تاریخ اسی محبوب کی تلاش کی ایک طویل داستان ہے جس کے اکثر باب گو خونچکاں اور دلفگار ہیں' لیکن بعض بعض دل افروز اور دل نواز بھی ہیں۔ خدا کے انبیاء اس لئے آئے تاکہ انسان کو بتائیں کہ وہ جس محبوب کو چاہتا ہے' وہ کون ہے اور اس سے محبت کرنے اور اس کی محبت اور رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ گویا دین اسلام' دینِ قیم یا انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی دائمی اور غیر مبدل فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جائے' تاکہ اس علم کی مدد سے وہ ان کو باحسن طریق پورا کر سکے۔ **اقم وجھک للدین حنیفا" فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم** (اپنا رخ خالص دین اسلام کی طرف کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی دین قیم ہے۔) ایک حدیث میں ہے **مامن مولود الایولد علی فطرۃ الاسلام فابواہ یھودانہ اوینصرانہ اویمجسانہ۔** (ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔)

اب بالتفصیل دیکھنا چاہئے کہ انسان کی فطرت کے معنی کیا ہیں اور اس کی فطرت کی محبت کس نوعیت کی ہے۔ انسان کی فطرت سے مراد انسان کی پیدائشی خواہشات ہیں۔ ان خواہشات کے دو طبقے ہیں: ایک تو اس کی وہ خواہشات ہیں جو حیوانی یا حیاتیاتی سطح پر ہیں مثلاً خوراک کی خواہش' جنسی تعلقات کی خواہش' ایسی چیزوں سے خوف یا نفرت جو بقائے حیات کے لئے مضر ہوں' ایسی چیزوں سے رغبت جو بقائے حیات کے لئے موید اور موافق ہوں' وعلیٰ ہذا القیاس۔ انسان کی یہ خواہشات اس میں اور نچلے درجے کے حیوانات میں مشترک ہیں کیونکہ انسان بھی ایک حیوان ہے' اگرچہ وہ حیوان ناطق ہے۔ ان خواہشات کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی اور اپنی نسل کی زندگی کو قائم رکھ سکے' لہٰذا ان کی تکمیل کے لئے اس کے جسم کے اندر ایک فطرتی حیاتیاتی (Biological) دباؤ موجود ہوتا ہے اور انسان اس دباؤ سے مجبور ہو کر ان کی تکمیل کرتا ہے۔ اگر ان خواہشات کے اندر یہ دباؤ موجود نہ ہوتا' تو انسان ان کو نظرانداز کر دیتا اور اس کی اور اس کی نسل کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ انسان کی ان خواہشات کو جو ایک اندرونی حیاتیاتی دباؤ رکھتی ہیں اور اس میں اور نچلے درجے کے حیوانات میں مشترک ہیں' جبلتوں (Instincts) کا نام دیا گیا ہے۔

اگر انسان کے اندر بس یہی خواہشات ہوتیں تو ان کی تکمیل کے لئے کسی سلسلہ انبیاء کی ضرورت نہ تھی' کیونکہ جس طرح حیوان مجبوراً ان کی تکمیل کر لیتا ہے انسان بھی کر لیتا ہے۔ پھر انسان' انسان کاہے کو ہوتا' وہ حیوان ہی ہوتا اور حیوان ہی کہلاتا' لیکن انسان کے اندر خواہشات کا

ایک اور طبقہ بھی ہے جو اس طبقہ سے اوپر ہے۔ انسان کی خواہشات کا یہی طبقہ انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتا ہے' وہ انسان کے ساتھ خاص ہے اور حیوان اس سے قطعاً" بہرہ ور نہیں۔ اس طبقے کی خواہشات حیاتیاتی نوعیت کی نہیں بلکہ نفسیاتی نوعیت کی ہیں' یعنی ان کا مقصد جسم کی نشوونما نہیں' بلکہ روح یا نفس انسانی کی نشوونما ہے۔ اس طبقے کی ساری خواہشات صرف ایک خواہش کے تابع ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہو گا کہ اس طبقہ میں صرف ایک ہی خواہش موجود ہے۔ یہ خواہش کسی حسین و جمیل تصور یا نصب العین (یعنی ایسا تصور یا نصب العین جس کی طرف انسان حسن و جمال کی انتہا کو منسوب کرے' خواہ وہ اس میں موجود ہو یا نہ ہو) کی شدید محبت کی صورت اختیار کرتی ہے۔ تصور یا نصب العین کی محبت' اگر پوری طرح سے ترقی کر کے قوی ہو جائے تو انسان کی ساری شخصیت پر حکمران ہوتی ہے' یہاں تک کہ اس کی نچلے درجے کی ساری خواہشات کو اپنی اغراض کے لئے کام میں لاتی ہے۔ اور اگر ضرورت ہو' تو ان کے شدید اندرونی دباؤ کے باوجود ان کو روک دیتی ہے' یہاں تک کہ خود جسم کو جس کی حفاظت اور نشوونما کے لئے وہ موجود ہیں' ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔ انسان اگر اپنے تصور سے شدید محبت رکھتا ہو' تو اس کی خاطر مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

وہ تصور یا نصب العین جسے انسان اپنا محبوب بنائے' کیسا ہونا چاہئے' اس کا جواب خود انسان کی فطرت یا اس کے جذبہ محبت کی نوعیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ صرف ایسے تصور سے تسکین اور اطمینان پا سکتا ہے جو اپنے اوصاف میں ہر ایسے عنصر سے پاک ہو جسے انسان کسی طرح سے بھی نقص قرار دے سکے' کیونکہ نقص محبت کا دشمن ہے۔ انسان کی فطرت کسی تصور کو ناقص جان کر اس سے محبت نہیں کر سکتی۔ وہ ناقص تصور سے محبت کرتی ہے' لیکن اسی وقت تک جب تک کہ اس کا نقص انسان کی نظروں سے اوجھل رہے اور اس میں اسے کمال ہی کمال نظر آئے۔ اس کے برعکس انسان کے محبوب تصور کے اندر وہ تمام صفات بدرجہ کمال موجود ہونی چاہئیں جن کی طرف وہ حسن و جمال منسوب کرتا ہو یا کر سکتا ہو۔ پھر اس کے حسن و جمال کی کوئی انتہا نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اگر کبھی اس کی انتہا ہو جائے تو پھر انسان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ اس سے سیر ہو جاتی ہے اور سیر ہو کر بیزار ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرتی محبت کسی ایسے محبوب کے لئے بنائی گئی ہے جس کے حسن کی کوئی حد نہیں' پھر وہ محبوب ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں میں کوئی دوسرا ذرہ بھر شریک نہ ہو کیونکہ انسان کی فطرت بیک وقت ایک سے محبت کر سکتی ہے' دو سے نہیں کر سکتی۔ ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ (اللہ نے آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے) پھر انسان چونکہ خود زندہ ہے' وہ کسی مردہ کو محبوب نہیں بنا سکتا۔ مردہ ہونا ایک عیب ہے۔ پھر اس محبوب کی زندگی ایسی ہونی چاہئے جو ازلی اور ابدی ہو اور جسے کبھی فنا نہ ہو۔

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است
وز شراب جانفزایت ساقی است

(عشق وہی زندہ قرار پا سکتا ہے جو باقی رہنے والا ہو اور ساقی ازل کی جانفزا شراب سے اس میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہو۔)

کیونکہ اگر اسے کبھی فنا آسکتی ہو' تو وہ آج بھی بالقوہ مردہ ہی ہے۔ پھر ضروری ہے کہ اس میں زندگی کے وہ تمام اوصاف' جن سے انسان ایک گونہ آشنا ہے' بدرجہ کمال موجود ہوں' یعنی وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہو' انسان کی ہر بات سمجھتا ہو' اس کے دل کی محبت کو جانتا ہو اور اس کی قدر دانی کر سکتا ہو' محبت کا جواب محبت سے دے سکتا ہو۔ انسان کی فطرت ایسی شخصیت سے ہی محبت کر سکتی ہے جو خود محبت کرنے والی ہو' ودود ہو۔ پھر انسان چاہتا ہے کہ سارے اختیارات اس کے محبوب کے ہاتھ میں ہوں' یعنی وہ قادر مطلق ہو' ورنہ کوئی دوسرا اس کی محبت میں شریک ہو جائے گا' حالانکہ اس کے دل میں کسی دوسرے کے لئے گنجائش ہی نہیں۔ وہ اس کا اور ساری کائنات کا خالق ہو' کیونکہ اگر انسان اور ساری کائنات انسان کے اس محبوب کی قدرت کے بغیر' خود بخود وجود میں آ گئے ہوں' تو پھر انسان کو اس سے کیا علاقہ ہے اور انسان کو کیا پڑی ہے کہ اسے اپنا محبوب بنائے' پھر تو انسان اس کی ہمسری کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے' لیکن اس کی فطرت ایک ہمسر کو نہیں چاہتی' بلکہ ایک ایسی ہستی کو چاہتی ہے جو اس ساری شان' عظمت اور کبریائی کی مالک ہو جس کا تصور انسان کر سکتا ہے بلکہ اس کی شان' عظمت اور کبریائی اس سے بھی زیادہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا محبوب بعض باتوں کو پسند کرے اور بعض کو ناپسند کرے۔ اس کی کوئی مرضی اور مدعا ہو تاکہ وہ اس کی مرضی کو پورا کر کے اس کی خدمت اور اطاعت کی لذت سے بہرہ اندوز ہو۔ اس کے بغیر اس کی محبت ناتمام اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ پھر وہ محبوب بے دست و پا نہ ہو کہ جو چاہے اس کی مرضی کی مخالفت کرے اور وہ کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس کے بے دست و پا ہونے کی صورت میں اس کے چاہنے والے تو اس کی مرضی پوری کریں گے اور اس کے بھلانے والے ان کا بنا ہوا کام بگاڑتے چلے جائیں گے اور اس کی مرضی کبھی پوری نہیں ہو گی' اور اس کے چاہنے والے بھی اس کی اطاعت' خدمت اور محبت کو ایک بے سود مشغلہ تصور کرنے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ ان کا محبوب ایک کمزور اور ناتوان ہستی ہے جو قطعاً" محبت کے قابل نہیں۔ پس انسان کے محبوب کے اندر' صفات جمال کے ساتھ ساتھ' صفات جلال یعنی قہر' غصہ اور انتقام کی صفات کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اس کے اندر صفات جمال بھی موجود نہیں ہوں گی۔

اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ان صفات میں سے کوئی ایک صفت' یا اس کا کوئی جزو' یا کوئی

پہلو ایسا ہے جو اس کے محبوب کے اندر موجود نہیں' تو وہ اسے ایک نقص سمجھتا ہے اور فوراً اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی فطرت کی محبت ایک ایسے نئے محبوب کی تلاش میں نکل پڑتی ہے جو بدرجہ کمال ان تمام صفات کا مالک ہو۔ جب تک انسان کو محبت کرنے کے لئے اس قسم کا تصور نہ ملے' اس کی محبت تشنہ رہتی ہے اور اس کے دل کو اطمینان یا قرار نصیب نہیں ہوتا اور اس کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان ایک درخت یا پتھر یا زمین کے ایک ٹکڑے کو بھی اپنا محبوب قرار دے' تو اس کو بھی زندہ اور سمیع و بصیر اور علیم و خبیر سمجھتا ہے اور تمام صفات جمال و جلال اس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جب انسان ایک تصور کو اپنی محبت کے لئے منتخب کرتا ہے' تو چونکہ وہ اس کی طرف صفات کمال منسوب کرتا ہے' اسے دل و جان سے چاہتا ہے' اس کے گن گاتا ہے اور اپنی زندگی کی شب و روز کی ساری سرگرمیوں کو اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے وقف کر دیتا ہے لیکن چونکہ انسان کو ہستی کامل کا علم نہیں ہوتا' وہ اکثر اپنے انتخابات میں غلطی کرتا ہے اور ایک ایسے تصور کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے جس میں صفات جمال و جلال درحقیقت موجود نہیں ہوتیں' بلکہ ایک دو صفات جمال کی جھلک اس میں دیکھ کر وہ باقی صفات جمال کو غیر شعوری طور پر اس کی طرف منسوب کر دیتا ہے' لیکن جب وہ محبوب کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لیتا ہے اور اس کی صفات جمال پر غور کرنے اور اس کی خواہشات کی پیروی میں تگ و دو کرنے کا موقع پاتا ہے' تو کچھ عرصہ کے بعد اسے بھی ترک کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

نوع بشر کی ساری تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال کی ساری داستان تصور کامل کی اسی تلاش سے بنی ہے۔ جب ایک قوم کسی تصور کو اختیار کرتی ہے' تو اس کی اطاعت' خدمت اور محبت کو کمال پر پہنچاتی ہے۔ یہ قوم کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب اس تصور کے نقائص اپنا عمل کرتے ہیں تو اس کی محبت انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہ قوم کے انحطاط کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ قوم اس تصور کو ترک کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک طرف تو انسان کے شعور یا اس کی فطرت کے اندر ایک ایسے تصور کی محبت رکھ دی گئی ہے جو کمال حسن و جمال ہو' جو اس کا الٰہ یا معبود ہو' اور دوسری طرف کائنات کے معمہ کا کوئی حل اس سے زیادہ معقول اور مدلل اور حقائق علمی کے مطابق نہیں کہ انسان اور کائنات کا ایک خالق ہے جو صفات جمالی اور جلالی کے کمال کا مالک ہے۔ انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ تصور کامل جس کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جس کے بجائے غلط اور ناقص تصورات کا انتخاب کر کے بعد میں دکھ' مایوسی اور تباہی کا شکار ہوتا ہے' وہی ذات پاک ہے جو اس کی اور کائنات کی خالق ہے۔ تم خواہ اسے کسی نام سے پکارو' لیکن وہی ہے جو

صفات جمال و جلال کا مالک ہے اور ان اوصاف کا مالک اور کوئی نہیں۔ پس وہی ہے جو خدمت اور اطاعت اور تعریف اور محبت کے لائق ہے۔ قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی۔ (کہو' اسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر یا کسی اور نام سے پکارو۔ تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔) وللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا۔ (تمام اچھے نام اللہ کے ہیں' اسے ان ناموں سے پکارو۔) الحمد للہ۔ (سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔)

ہر نبی کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی: لاالہ الا اللہ (خدا کے سوائے کوئی معبود یا محبوب نہیں' اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے تابع بناؤ' اس کی عبادت کرو۔) حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا: انی لکم نذیر مبین الاتعبدوا الا اللہ (میں تمہیں صاف طور پر خبردار کرتا ہوں کہ عبادت کرو صرف اللہ کی۔) حضرت ہودؑ نے بھی یہی کہا تھا: یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ (اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔) حضرت صالحؑ کی پکار بھی یہی تھی: یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ' اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی یہی تھی: یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم (اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے۔) انما یوحی الی انما الھکم الہ واحد (بے شک مجھ پر وحی آتی ہے' بے شک تمہارا معبود ایک معبود ہے۔) چونکہ ناقص اور غلط تصورات بہت سے ہو سکتے ہیں اور کامل اور صحیح تصور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اس لئے اس عقیدہ کو عقیدہ توحید کہتے ہیں۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اگر انسان کو صحیح اور کامل تصور کا علم نہیں تو نہ سہی۔ جب وہ تصور کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے تو تعلیم نبوت کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن یہ خیال قطعاً" غلط ہے۔ تصور سے انسان کا چھٹکارا نہیں۔ وہ کسی نہ کسی تصور کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت کی ایک ایسی خواہش ہے جسے وہ ایک لمحے کے لئے بھی ملتوی نہیں کر سکتا۔ اگر اسے اچھا تصور ہاتھ نہ آئے گا تو وہ کسی برے تصور سے اپنی فطرت کی ضرورت کو پورا کرے گا اور اسی کو ہر لحاظ سے اچھا تصور سمجھ لے گا' جیسے وہ شخص جسے بھوک لگی ہو' اگر گندم کی روٹی نہ پائے تو جو کی روٹی اور بعض وقت درختوں کے پتے کھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی بھوک کے تقاضے کو روک نہیں سکتا۔ تصور کی خواہش بھوک سے بلکہ انسان کی تمام خواہشات سے زیادہ قوی اور زیادہ شدید ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے انسان اپنی ساری خواہشات پر لات مار دیتا ہے بلکہ زندگی تک کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ خواہش ایک لمحے کے لئے بھی رک جائے (جیسا کہ اس کے غلط استعمال کا پتہ چل جانے کے بعد اکثر ہوتا ہے) تو انسان جنون' ہسٹیریا' پریشانی اور دوسرے دماغی

امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کی اس اہم ترین خواہش کی تکمیل کا انتظام قدرت نہ کرتی تو بہت ستم ہوتا لیکن قدرت نے سلسلہ انبیاء کے ذریعہ سے انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کا انتظام کیا ہے' لہٰذا نبوت انسان کے لئے ایک بہت بڑی نعمت اور بڑی رحمت ہے۔ **وما ارسلنک الارحمتہ للعلمین** (اے نبی! ہم نے آپ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔)

انسان کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کی تکمیل کا سامان قدرت خود فراہم نہ کرتی ہو۔ جس طرح قدرت انسان کی حیوانی یا حیاتیاتی سطح کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرتی ہے' جس طرح اس کی پیاس بجھانے کے لئے پانی چشموں سے پھوٹتا اور دریاؤں اور ندی نالوں میں بہتا ہے یا جس طرح اس کی بھوک دور کرنے کے لئے زمین' ہوا' بارش اور سورج مل کر غلہ پیدا کرتے ہیں' اسی طرح انسان کی انسانی یا نفسیاتی سطح کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خدا کے نبی اپنی دعوت لے کر آتے ہیں۔ انبیاء کی تعلیم کی پے در پے کامیابیاں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کی تعلیم انسان کی فطرت کے ایک خلا کو پورا کرتی ہے۔ اگر ہم انسان کی فطرت کے اس پہلو کو' جس کی رو سے انسان کسی نہ کسی تصور حیات کو' خواہ وہ اچھا ہو یا برا' قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے' ٹھیک طرح سے ذہن میں رکھیں تو پھر کارخانہ قدرت کے اندر نبوت کا مقام اور تعلیم نبوت کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ناقص تصور حیات اور ناقص معبود یا محبوب کو قبول کرنے کے نقصانات اس قدر شدید ہیں کہ اگر قدرت نبوت کے ذریعہ سے کامل تصور حیات اور کامل معبود یا محبوب کی طرف راہ نمائی نہ کرتی تو کرۂ ارض پر انسان کی زندگی کے باقی رہنے کی کوئی امید نہ ہو سکتی۔ **والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا و عملوا الصلحت وتواصوا بالحق و تواصوابالصبر** (قسم ہے زمانے کی۔ بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے نیک کام کئے اور حق کی نصیحت کی اور صبر کی نصیحت کی۔) ناقص تصورات کے نقصانات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ایک تصور حیات' یا الہ یا معبود (خواہ وہ حقیقی ہو یا غیر حقیقی) انسان کے فکر و عمل پر کیا اثرات پیدا کرتا ہے۔ مختصراً وہ اثرات حسب ذیل ہیں:

(ا) چونکہ انسان اپنے تصور کو تمام عمدہ صفات کا مالک سمجھتا ہے' لہٰذا وہ اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کی تعریف اور حمد اور ستائش میں رطب اللسان رہتا ہے۔ چونکہ وہ غیر حقیقی معبود کی طرف بھی حقیقی معبود ہی کی صفات منسوب کرتا ہے لہٰذا وہ اسے بھی حقیقی معبود ہی کی طرح چاہتا ہے۔ **واتخذوا من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ والذین امنوا اشد حباللہ** (اور انہوں نے اللہ کے سوا شریک بنا لئے۔ وہ ان سے محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت ہونی چاہئے۔

اور اہل ایمان اللہ سے شدید ترین محبت رکھتے ہیں۔)

(۲) انسان اپنی ساری زندگی کو اس تصور کی خدمت اور اطاعت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ اس تصور کی تائید اور ترقی کے لئے کونسا کام اسے کرنا چاہئے اور کونسا نہیں کرنا چاہئے' وہ اس تصور کی نوعیت سے اپنے لئے ایک ضابطہ یا قانون حیات اخذ کرتا ہے جو اوامر اور نواہی پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کی ساری زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل کا کام دیتا ہے۔ انسان تصور کی محبت سے مجبور ہو کر اس ضابطہ حیات پر عمل کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ اگر وہ فی الواقع اپنے تصور سے محبت کرتا ہے تو وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے تصور کی فطرت کے منافی ہو' یا اس کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔

(۳) ایک تصور کے پرستار اپنے فطرتی جذبہ محبت کی نوعیت سے مجبور ہو کر جس طرح تصور سے محبت کرتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ بھی محبت کرتے ہیں' لہٰذا وہ مل کر ایک جماعت یا ایک سوسائٹی کی شکل اختیار کرتے ہیں جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔ یہ ریاست ان کے مشترک تصور کی خدمت اور اطاعت کے لئے وجود میں آتی ہے اور اس کے ذریعہ سے افراد اپنے تصور کی خدمت اور اطاعت کے لئے اور زیادہ قوی اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ ریاست کے اندر فرد اور جماعت کی زندگی ریاست کے تصور حیات کے ماتحت صورت پذیر ہوتی ہے۔ جماعت کا نظام معاشیات' نظام قانون' نظام اخلاق' نظام سیاست' نظام تعلیم' نظام حکومت' حکمت صلح و جنگ' غرضیکہ فرد اور جماعت کی زندگی کا ہر شعبہ جماعت کے تصور کی ضروریات کے ماتحت وجود میں آتا ہے۔

ان تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی مدح و ذم کا معیار' ضابطہ اخلاق و عمل' نظام تعلیم و تعلم' نظام اقتصادیات و معاشیات' نظام حکومت و سیاست' نظام قانون و عمل' حکمت صلح و جنگ' سب کے سب ہمارے تصور حیات ہی کی شاخیں ہوتی ہیں اور ان کی نوعیت اور فطرت ہمارے تصور کی نوعیت اور فطرت پر موقوف ہوتی ہے۔ جس قدر ہمارا تصور بلند اور اعلیٰ ہو گا اسی قدر ہماری زندگی کے یہ پہلو بھی عمدہ' سلجھے ہوئے' بے نقص اور بے عیب ہوں گے۔ انبیاء کے پیش کردہ تصور توحید سے بلند تر اور اعلیٰ تر تصور ممکن ہی نہیں' کیونکہ اس سے بلند تر تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تصور بھی ہماری انفرادی اور جماعتی زندگی کے تمام کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے' ان کی ایک خاص نوعیت مقرر کرتا ہے اور انہیں ایک خاص شکل دیتا ہے۔ ان کی یہ شکل یا نوعیت براہ راست تصور کامل کی فطرت یا حق تعالیٰ کے اوصاف جمال سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جب ہمارا تصور حیات عمدگی' خوبی اور پاکیزگی کے کمال پر ہو' جیسا کہ توحید کا تصور فی الواقع ہے' تو ضروری

ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ایک پہلو بھی عمدگی' خوبی اور پاکیزگی کے کمال پر ہو' لہٰذا جونہی کوئی انسان خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے' اس کی ساری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ خداوند تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہوتا جاتا ہے اور صفات باری تعالیٰ کی عمدگی' خوبی اور پاکیزگی اس کی زندگی کے اندر سرایت کرتی جاتی ہے۔

تعلیم نبوت سے انحراف کو اسلام کی اصطلاح میں کفر کہا جاتا ہے۔ کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان غلط تصورات کی محبت پر قائم رہتا ہے۔ غلط تصورات کی محبت کے نقصانات حسب ذیل ہیں:

(ا) غلط تصور میں چونکہ صفات حسن در حقیقت موجود نہیں ہوتے' اس کی محبت سے غلط قسم کی حمد و ستائش پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کی اقدار کے متعلق انسان کا زاویہ نگاہ غلط ہو جاتا ہے۔ انسان اچھی چیزوں کو برا اور بری چیزوں کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ جو چیز محبت کے لائق ہو اس سے نفرت کرتا ہے اور جو چیز نفرت کے لائق ہو اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں غلط دیکھتی ہیں' اس کے کان غلط سنتے ہیں' اس کا دماغ غلط سوچتا ہے اور دل غلط سمجھتا ہے' گویا اس کی آنکھیں' اس کے کان' اس کا دماغ اور دل کام ہی نہیں کرتے۔ **لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھاولھم اذان لا یسمعون بھا** (ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔) غلط تصور کے پرستار انصاف' نیکی' مساوات' جمہوریت اور سچائی کا نام لیتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں انصاف' نیکی' مساوات' جمہوریت اور سچائی کے معنی وہ نہیں ہوتے جو حق پرستوں کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہر غلط تصور کا پرستار اخلاقی اقدار کے معنی غلط سمجھتا ہے بلکہ غلط تصورات کے ماننے والے ان اقدار کے معنی کے متعلق ایک دوسرے سے بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تصور کی نیکی' سچائی اور مساوات الگ قسم کی ہوتی ہے۔

(۲) اپنی صحیح فطرت کو پانا اور بہ تمام و کمال اس کے ممکنات کا اظہار کرنا انسان کی منزل مقصود ہے جس پر زود یا بدیر پہنچنے کے لئے ہر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے لیکن اس منزل پر انسان صرف ایسے عمل ہی سے پہنچ سکتا ہے جو خدا کی محبت کے ماتحت سرزد ہو۔ غلط تصور کی محبت کے ماتحت جو عمل سرزد ہوتا ہے' وہ انسان کو اس کی منزل کی راہ پر نہیں لے جاتا بلکہ اس سے دور ہٹاتا جاتا ہے۔ وہ اس راہ پر جس قدر آگے جائے گا' منزل سے ہٹتا جائے گا اور منزل کی طرف بڑھنے کے لئے اسے پھر واپس آنا پڑے گا' خواہ یہ صورت فرد کی موت کے بعد ہی پیدا ہو' لیکن انسان کی فطرت اس بات کی ضامن ہے کہ یہ ضرور پیدا ہو کر رہے گی' پھر اسے معلوم ہو گا کہ اس کا سارا عمل بیکار تھا۔ ناقص تصور ناپائیدار ہوتا ہے۔ اس کی محبت تادیر قائم نہیں رہتی کیونکہ اس کا نقص

زود یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے' پھر اس کا ماننے والا اسے خود ہی چھوڑ دیتا ہے۔ جو شخص سچے خدا کو چھوڑ کر جھوٹے خدا کی عبادت کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بڑھیا عرصہ دراز تک محنت سے سوت کاتے اور جب کات چکے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ قرآن اس بے سود مشغلہ سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ **ولاتکونوا کالتی نقضت غزلھامن بعد قوۃ انکاثا** (اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے تھوڑا تھوڑا کر کے سوت کاتا اور اس کے بعد تار تار کر دیا۔) غلط تصور بیت عنکبوت کی طرح کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ **ان الذین اتخذوا من دون اللہ اندادا کمثل العنکبوت اتخذت بیتا فان اوھن البیوت لبیت العنکبوت** (جنہوں نے اللہ کے سوا شریک بنالئے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے گھروندا بنایا۔ بے شک مکڑی کا گھروندا سب سے کمزور گھروندا ہے۔) یا اس کی مثال ناکارہ پودے کی طرح ہے جسے باغ کا مالی اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے تاکہ جن پودوں کی اسے ضرورت ہے ان کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ **مثل کلمتہ خبیثتہ کشجرۃ خبیثتہ اجتثت من فوق الارض مالھامن قرار** (بری بات کی مثال برے پودے کی سی ہے جو زمین پر سے اکھاڑ دیا جاتا ہے اور اس کے لئے ٹھہراؤ نہیں۔) اس کے برعکس تصور کامل کی محبت دائمی اور لازوال ہوتی ہے جو برابر ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کی محبت میں کسی مایوسی یا ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ **ومن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا** (اور جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے' اس نے مضبوط رسی کو تھام لیا جو ٹوٹے گی نہیں۔) لہٰذا باقی تصورات مٹ جائیں گے اور تصور کامل دنیا میں باقی رہ جائے گا اور اس کی شان و شوکت تمام دنیا کا احاطہ کرے گی۔ وہ ایک پائیدار اور پھلدار درخت کی طرح ہے جسے بڑھنے اور اور پھولنے کا موقع دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں اور اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں جم جاتی ہیں۔ اس کا بونے والا اس کے پھل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ **ومثل کلمتہ طیبتہ کشجرۃ طیبتہ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا** (اور اچھی بات کی مثال اچھے درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط و مستحکم ہے اور شاخیں آسمان میں' ہر بار رب کے حکم سے اس پر پھل آتا ہے۔)

(۳) چونکہ غلط تصورات بہت سے ہو سکتے ہیں' لہٰذا اگر نوع بشر تعلیم نبوت سے انحراف کرے تو ضروری بات ہے کہ وہ ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔ **قل ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم من سبیلہ** (کہہ دو یہ میرا سیدھا راستہ ہے' پس تم اس پر چلو اور دیگر راستوں پر مت چلو ورنہ اس راہ کے بارے میں تم تفرقے کا شکار ہو جاؤ گے۔) پھر چونکہ ہر

تصور کو ماننے والے اپنے تصور کو حسن و خوبی کی انتہا سمجھتے ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے تصورات کی قیمت پر اسے ترقی اور فروغ حاصل ہوتا رہے لہٰذا ہر تصور دوسرے تمام تصورات کا پنہاں یا آشکار دشمن ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا میں یہی صورت حال پیدا ہے۔ ہر قوم اپنے تصور کی ترقی اور ترفع کے لئے دوسری قوموں کے مقابل صف آرا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں کی ہولناک تباہیوں کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد قومیں اپنے تصورات کی فطرت سے مجبور ہو کر ایک عالمگیر جنگ میں کودنے کی تیاریاں کر رہی ہیں جو ممکن ہے کرۂ ارض سے انسان کو نیست و نابود ہی کر دے۔

انبیاء کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا اس خطرناک صورت حال کا واحد علاج ہے۔ عقیدہ توحید ایک بیج ہے اور اسلام وہ درخت ہے جو اس بیج سے پھوٹا اور بڑھا اور پھولا ہے۔ اسلام کے باقی تمام عقائد مثلاً اطاعت نبوت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' ذکر و فکر کی ضرورت' عمل صالح کی ضرورت' عمل کی جزا اور سزا کا اعتقاد' سیاسی آزادی کا اعتقاد' جہاد کی تبلیغ اور اخوت سب عقیدہ توحید ہی کی شاخیں ہیں۔ دراصل اسلام کا کوئی عقیدہ یا اس سے پیدا ہونے والا کوئی عمل ایسا نہیں جو عقیدہ لاالہ الا اللہ سے الگ کوئی حیثیت یا اہمیت رکھتا ہو۔ اسلام کے سارے عقائد اسی عقیدے سے ماخوذ اور اسی کے تابع ہیں اور اسی کی تائید و توثیق اور توسیع کے لئے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جو شخص خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اس کے سوا کوئی نہیں جو صفات جمال کا مالک ہو۔ وہی ہے جو حی و قیوم ہے' کائنات کا خالق ہے' رب اور رحمان اور رحیم اور کریم ہے' رازق ہے' عادل ہے اور دوسروں کا رحم' ربوبیت' عدل' قدرت' رزاقیت اور خالقیت اور تمام صفات جمال' جس حد تک وہ ان میں موجود ہیں' اسی کی صفات جمال کا پرتو ہیں۔ خدا کی صفات جمال میں محبت کی صفت ایک مرکز کی طرح ہے جس کے گرداگرد' جس کے ماتحت اور جسکی خدمت اور اعانت کے لئے اس کی باقی تمام صفات جمال اظہار پاتی ہیں۔ حق تعالیٰ کی صفت محبت کو قرآن نے رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ **وکتب علی نفسہ الرحمتہ** (اس نے اپنے آپ پر محبت کو فرض کر لیا ہے۔) **وسعت رحمتی کل شی** (میری محبت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔) یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لئے "الرحمن" کا نام پسند کرتا ہے جس کے معنی ہیں عام رحمت کرنے والا۔ خدا کی محبت انسان کے لئے ہے اور وہ توقع رکھتا ہے کہ انسان بھی اس سے محبت کرے۔ اس نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس کی اپنی صفات کی طرح انسان کی صفات کا مرکز بھی محبت ہی کو بنایا ہے۔ اس محبت کی صفت کی وجہ سے انسان خدا کی باقی صفات سے' جو محبت کی موید اور معاون ہیں' حصہ لیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ **ان اللہ خلق ادم علی صورتہ** کا مطلب یہی ہے۔ اپنی فطرت کے اندر صفات ربانی کا پرتو رکھنے کی وجہ سے ہی انسان خدا کا خلیفہ قرار

پایا ہے۔ انسان کا فطرتی جذبہ محبت' صرف خدا کی محبت اور عبادت سے مطمئن ہوتا ہے اور خدا کی عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان جس حد تک کہ اس کے لئے ممکن ہو' اپنے آپ کو خدا کے اوصاف کے ساتھ متصف اور اس کے اخلاق کے ساتھ متخلق کرے۔ اس راہ میں وہ جس قدر زیادہ ترقی کرے گا اسی قدر خدا کی محبت اور نیابت کا اہل ہو گا۔

احساسِ جمال

خدا کی صفات جمال پر ایمان لانے سے انسان کے دل میں حسن کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کی عبادت کی ابتدا ہوتی ہے۔ معبود وہی ہو سکتا ہے جو محبوب بھی ہو اور محبوب وہی ہو سکتا ہے جس کے اندر صفات حسن بدرجہ کمال موجود ہوں کیونکہ حسن ہی ہے جو انسان کے اندر محبت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے' جو اس کا سر کسی محبوب کے سامنے جھکا سکتا ہے۔ تمام حسن' حسن معنوی ہے اور اس کا مالک فقط اللہ ہے۔ خدا کو اس سے بحث نہیں کہ لوگ اس کا ذاتی نام کیا قرار دیتے ہیں' اسے اللہ کہتے ہیں یا برہما یا گاڈ۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی صفات پر ایمان لایا جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں صفات جمال کو اسمائے حسنیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ **قل ادعوا اللہ اودعوا الرحمن ایا ماتدعوا فلہ الاسماء الحنسی۔ ۔ ۔ لہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا۔** خدا کی صفات جمال میں اس کی صفات جلال' یعنی قہر' غصہ اور انتقام کی صفات بھی شامل ہیں کیونکہ یہ صفات بھی اس کی مرکزی صفت محبت کے ماتحت ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جمال بغیر جلال کے مکمل نہیں ہوتا۔ محبت کی تکمیل کے لئے نفرت اور تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہے۔ محبت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے نقیض سے نفرت کی جائے۔ نیکی سے محبت وہی کرتا ہے جو بدی سے نفرت کرتا ہو۔ انصاف وہی قائم کر سکتا ہے جو بے انصافی کا قلع قمع کرنے کے لئے تیار ہو۔ رحم وہی کر سکتا ہے جو ظلم کو برداشت نہ کرے۔ چونکہ صفات جلال مقاصد محبت کی تکمیل کے لئے ظہور میں آتی ہیں' لہٰذا وہ بھی محبت کا ایک حصہ ہیں۔ خدا کی محبت انسان کی تعمیر اور تربیت کرتی ہے۔ اور اس کی نفرت اس تعمیر اور تربیت کی رکاوٹوں کو دور کرتی ہے' چنانچہ ارشاد ہے **ولنذ یقنھم عذاب الاولی دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون** (اور بیشک ہم بڑے عذاب سے پہلے ایک چھوٹا عذاب چکھائیں گے تاکہ وہ باز آئیں۔)

جب عذاب کی وجہ سے انسان کے اندر خدا کی تخلیق' تعمیر اور تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو عذاب اس سے روک لیا جاتا ہے اور اسے رحمت و ربوبیت کے دائرہ میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ خدا کے عفو کا مطلب یہی ہے۔ خدا کی صفت عفو خود بتا رہی ہے کہ اس کا عذاب' عذاب کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ انسان اس کی رحمت' ربوبیت اور محبت کی طرف عود

کرے۔ خدا کی صفات جمال' اس کی اصلی اور بنیادی صفات ہیں اور صفات جلال ان کی موید اور معاون۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں حق تعالیٰ کی صفات کی مجموعی نوعیت کا ذکر کیا ہے' وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کے اسماء' اسماء حسنیٰ ہیں' یعنی وہ نام جن میں حسن ہے اور جو کشش کرنے والے ہیں۔ خدا کے جمال کے اندر جلال ہے اور جلال کے اندر جمال۔ اس کی ذات میں جلال اور جمال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ جلال کے بغیر نہ تو جمال کا ظہور مکمل ہوتا ہے اور نہ اس کی معرفت۔ خدا نے انسان کو اپنی صفات جلال سے اسی طرح حصہ دیا ہے جس طرح اپنی صفات جمال سے' کیونکہ انسان کی محبت بھی صفات جلال کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ خدا کی عبادت یا محبت انسان کی جمالی اور جلالی صفات کو اس کی استعداد کے مطابق کمال پر پہنچاتی ہے۔ اگر انسان خدا کی صفات جمال و جلال دونوں سے بہرہ ور نہ ہو تو خدا کی نیابت کے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ نوع انسان کی تربیت اور ترقی کے لئے اس کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے اور یہ وہی کام ہے جو خدا اپنے نائب مرد مومن کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ یرید اللہ لیعذبھم بایدیکم۔ (اللہ چاہتا کہ تمہارے ہاتھوں انہیں عذاب دے)..... یہی جہاد ہے۔

جہاد مرد مومن کی صفات جلال کا ظہور ہے جس سے اس کی صفات جمال کے ظہور کے لئے راستہ صاف ہوتا ہے۔ بہائیت نے جو سب سے بڑی گمراہی انسانوں میں پھیلائی ہے وہ یہی ہے کہ اب انسان کو صفت جلالی کی ضرورت نہیں۔ کیا اب انسان کی روحانی ترقی اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے؟ کیا اب نیکی کے راستے میں کوئی رکاوٹیں باقی نہیں رہیں؟ اگر رکاوٹیں موجود ہیں تو کیا خدا نے ان رکاوٹوں سے صلح کر لی ہے کہ اس کا عبد اور اس کا نائب انسان بھی ان سے صلح کر لے؟ کیا باطل نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں کہ اب حق کو غیر مسلح کرنے کی ضرورت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ صفات جلال انسان کی فطرت کا ایک ابدی اور ازلی جزو ہیں۔ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا' لاتبدیل لخلق اللہ.. جب تک دنیا کمال کو نہیں پہنچتی' خدا اور انسان کی جلالی صفات کا اظہار ہوتا رہے گا اور جب کمال کو پہنچے گی تو خدا اس دنیا کو فنا کر کے نئی دنیا بنالے گا تاکہ اس کی صفات جمال و جلال کا اظہار برابر ہوتا رہے۔ زندگی' جدوجہد کا نام ہے اور یہ باطل کے خلاف حق و صداقت کی جدوجہد ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے' ورنہ فقط دل ہی سے برا سمجھے' اور یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے' یعنی صفات جلالی کا ادنیٰ مظاہرہ ہے۔ من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان۔

عقیدہ توحید کے قبول کرنے یعنی خدا کی صفات حسن کا اقرار کرنے سے انسان کے اندر جو حسن کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کو علم یا ایمان یا حب اللہ یا معرفت حق کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر احساس کی طرح یہ احساس بھی عمل میں اپنا اظہار چاہتا ہے اور جوں جوں ہم اپنے عمل میں اس کا اظہار کرتے جاتے ہیں اس احساس میں ترقی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ احساس اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے اور یہ ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لئے قرآن میں جہاں " امنوا" کہا گیا ہے وہاں " عملوا الصلحت" بھی ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے کیونکہ عمل صالح یعنی خدا کی محبت کے ماتحت عمل کرنا، ایمان یا حب اللہ کی صرف ایک علامت ہے جس کے بغیر' اندرونی وصف ایمان یا احساس حسن کی کوئی علامت ہمارے پاس موجود نہیں ہوتی۔ عمل کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک مطالعہ جمال، یعنی خدا کی صفات حسن پر غور و فکر، اور دوسری اظہار جمال، یعنی اپنے اخلاق کے اندر صفات حسن کا ظاہر کرنا۔ عمل کے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے مدد معاون ہیں اور مل کر انسان کی محبت کو درجہ کمال پر پہنچاتے ہیں۔

مطالعہ جمال

مطالعہ جمال، صفات جمال کی علامات کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں مطالعہ جمال کی ابتداء مظاہر قدرت پر غور و فکر کرنے سے ہوتی ہے کیونکہ کائنات خدا کا فعل ہے اور خدا کی صفات کمال اس کے اندر اسی طرح ظہور پذیر ہیں جس طرح ایک مصور کے شاہکار میں اس کا کمال ہنر جلوہ ریز ہو۔ مظاہر قدرت پر غور و فکر سے انسان کو مفر نہیں کیونکہ وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

لہٰذا ہر انسان مجبوراً صفات جمال سے ایک ابتدائی تعارف پیدا کرتا ہے۔ اسی سے اس کے ایمان یا احساس حسن کا آغاز ہوتا ہے جس کے لئے اس کی فطرت کے اندر ایک مناسبت موجود ہے۔

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہے مجبور پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

لیکن اکثر بدقسمت انسان اس احساس کے مناسب اظہار کی راہ نہیں پاتے' یا راہ پانے کے بعد اس راہ کو دیدہ و دانستہ اختیار نہیں کرتے اور اس طرح اس احساس کو جو خدا کی ہستی کے اعتراف کے مترادف ہوتا ہے کچل ڈالتے ہیں' تاہم چونکہ اس احساس کی صداقت کی دلیل انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے اور یہ احساس اسے فطرتاً" مرغوب ہوتا ہے' اس لئے کلیتہً " کچلا نہیں جاتا بلکہ

انسان کے تحت الشعور میں دب کر رہ جاتا ہے۔ دہریت جہاں ہو فقط زبان پر ہوتی ہے' دل میں نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک منکر خدا مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ غلط تصورات کی محبت اسے فائدہ نہیں دے سکتی۔ پھر وہ جھوٹے خداؤں کو چھوڑ دیتا ہے اور سچے خدا کو پکارتا ہے۔ فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین فلما نجا ھم الی البر فمنھم مقتصد (اور جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں' اس کے دین کے لئے اخلاص ظاہر کرتے ہوئے۔ پھر جب وہ انہیں صحیح سلامت خشکی پر لے جاتا ہے تو ان میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو میانہ روی اختیار کرتا ہے۔) خدا کے انبیاء جب آتے ہیں تو وہ کوئی نئی بات نہیں کہتے بلکہ انسان کے اسی کچلے ہوئے اور دبے ہوئے احساس حسن کو پھر زندہ کرتے ہیں اور اس کے اظہار کی صحیح راہ اس کو بتاتے ہیں' چنانچہ ان کی تعلیم کا آغاز مطالعہ قدرت کی دعوت سے ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ صحیفہ قدرت پر غور و فکر کرو' کیا وہاں تمہیں خدا کی خالقیت' رحمت' ربوبیت اور جملہ صفات حسن کا پرتو عیاں طور پر نظر نہیں آتا اور تم اس کا اعتراف نہیں کرتے؟ خدا وہی ہے جو ان صفات حسن کا مالک ہو۔ فالکم اللہ ربکم انی تو فکون (وہی تمہارا اللہ تمہارا رب ہے' تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟) قل من یرزقکم من السماء (کہو' کون اسباب رزق اتارتا ہے آسمان سے؟) قل ارایتم ان اصبح ماء کم غورا فمن یاتیکم بماء معین۔ (کہو' کیا تم دیکھتے ہو اگر تمہارا پانی گہرائی میں چلا جائے تو پھر کون بہتا پانی تمہیں فراہم کرے گا؟)

قرآن نے ان مسلمانوں کو سراہا ہے جو کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اس عمل سے انسان کا احساس حسن بیدار ہی نہیں ہوتا بلکہ ترقی کرتا اور قوی تر ہوتا ہے۔ والذین یتفکرون فی خلق السموت والارض (اور جو لوگ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں۔)

قرآن نے خود مناظر قدرت میں سے ایک ایک کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ وہ غور کرے کہ کس طرح یہ مظاہر خدا کی صفات جمال و جلال کے آئینہ دار ہیں اور کیونکر انسان کو خدا کی معرفت کا فصیح و بلیغ درس دے رہے ہیں۔

فانظر الی اثار رحمت اللہ کیف یحیی الارض بعد موتھا ان ذلک لمحی الموتی وھو علی کل شی قدیر۔ (پھر اپنے اللہ کی رحمت کے آثار دیکھ اس نے زمین کے خشک ہونے کے بعد اسے کیسے زندہ کیا۔ وہی مردے کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

ھو الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء (وہی ہے جس نے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت۔)

وانزل من السماء ماء فاحیابہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابتہ

وتصریف الریاح والسحاب المسخرین السماء والارض ان فی ذالک لایت لقوم یوقنون (اور اس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر زمین کی موت کے بعد اسے زندگی بخشی اور اس میں ہر نوع کے جانور پھیلائے، اور ہواؤں کا چلنا اور آسمان اور زمین کے مابین بادلوں کا مسخر ہونا یعنی حسب الحکم بارش برسانا، ان سب میں اہل یقین کے لئے نشانیاں ہیں۔)

اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر سحابا فیبسطہ فی السماء کیف یشاء ویجعلہ کسفا" فتری الودق یخرج من خللہ فاذا اصاب بہ من یشاء من عبادہ اذھم یستبشرون (اللہ وہ ہے جو ہوائیں چلاتا ہے، پس وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ انہیں آسمان میں جیسے چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور انہیں روئی کے گالوں جیسے بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ میں سے مینہ برستا ہے۔ پس جب وہ اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے، مینہ سے نوازتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔)

یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی و یحی الارض بعد موتھا وکذ الک تخرجون (وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو زندہ کرتا ہے اس کی موت کے بعد۔ اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔)

ومن ایاتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشرتنتشرون ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمتہ ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون ○ ومن ایاتہ خلق السموت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لایت للعلمین ○ و من ایاتہ منامکم بالیل والنہار وابتغاء کم من فضلہ ان فی ذالک لایت لقوم یسمعون ○ ومن ایاتہ یریکم البرق خوفا" وطمعا" وینزل من السماء ماء فیحی بھا الارض بعد موتھا ان فی ذالک لایت لقوم یعقلون۔ (اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر تم انسان بن کر روئے زمین پر پھیل جاتے ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا جذبہ رکھا۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تم میں زبانوں اور رنگوں کا فرق رکھا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں علم رکھنے والوں کے لئے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں آسمانی بجلی دکھاتا ہے خوف اور امید کے ساتھ اور آسمان سے پانی نازل کرتا ہے، پس اس سے زمین تر و تازہ ہو جاتی ہے جو اس سے پہلے خشک ہو چکی تھی۔ بے شک

اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔)

افلاینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الارض کیف سطحت (کیا وہ اونٹ کی طرف دیکھتے نہیں' وہ کیسے پیدا کیا گیا اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے' وہ کیسے اٹھایا گیا ہے' اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے' وہ کیسے ہموار کی گئی ہے؟)

اللہ الذی خلقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ھل من شرکاء کم من یفعل من ذالکم من شی سبحانہ وتعالی عمایشرکون (اللہ وہ ہے جو تمہیں پیدا کرتا ہے پھر تمہیں موت دیتا ہے' پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو یہ سارے کام کر سکے؟ وہ پاک اور بلند ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں۔)

صفات جلال کے نشانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: **قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبتہ الذین کانوا من قبل کان اکثرھم مشرکین۔** (کہو ان سے زمین میں گھومو پھرو۔ پھر دیکھو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو تم سے پہلے تھے۔ ان میں سے اکثر مشرک تھے۔)

اس قسم کے مطالعہ جمال میں انسان اپنے احساس حسن کو بیدار کرنے اور ترقی دینے کے لئے مظاہر قدرت کو' جو قوانین قدرت کے تابع رونما ہوتے ہیں' خدا کی صفات کی علامات کے طور پر کام میں لاتا ہے۔

لیکن جب مومن کا احساس حسن ذرا ترقی کر جاتا ہے تو پھر اسے مزید ترقی دینے کے لئے وہ ایک اور قسم کی علامات کو بھی کام میں لاتا ہے اور وہ الفاظ کی علامات ہیں جنہیں قرآن حکیم نے اسمائے حسنیٰ کہا ہے۔ ان الفاظ کے معانی پر غور و فکر کرنے اور ان پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے مومن کی صفات محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ جمال کا دوسرا طریق ہے اور اسے ذکر کہتے ہیں۔ اس کی اصل بھی صفات جمال پر غور و فکر ہے۔ زبان سے اسمائے حسنیٰ کا نام لینا یا ذکر کرنا ان پر غور و فکر کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ چونکہ اسمائے حسنیٰ سب کے سب مدح و ستائش کے نام ہیں' لہٰذا ذکر محبوب کی مدح و ستائش اور اس کی عظمت و جلال اور کبریائی کے اعتراف اور اقرار کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ستائش حسن اگرچہ احساس حسن کے اظہار ہی کا دوسرا نام ہے اور احساس حسن کا نتیجہ ہے لیکن یہ ایک ایسا فعل ہے جو خود احساس حسن کی کیفیت کو بدلتا جاتا ہے اور اسے ترقی دیتا اور عمیق تر اور قوی تر کرتا جاتا ہے کیونکہ اس سے اوصاف حسن پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوصاف باری تعالیٰ کی خوبی اور جمال سے پردے اٹھ جاتے ہیں' ان کا حسن اور نمایاں ہو جاتا ہے اور ان کی محبت اور معرفت بڑھ جاتی ہے۔

ذکر کا مقصد حسن کی ستائش ہے جو دراصل انسان کے ضمیر کا فعل ہے اور محض اس کی زبان کا

فعل نہیں۔ ذکر انسان کے دل کی کیفیت کا نام ہے' فقط اس کی زبان کی کیفیت کا نام نہیں۔ اگر ذکر صفات حسن پر غور و فکر کے بغیر ہے تو وہ جستجوئے جمال کی مخلصانہ کوشش نہیں اور اس سے افزائش محبت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ذکر کی ایک خاص صورت وہ ہے جسے صلوٰۃ یا نماز کہا جاتا ہے اور جو ہم پر دن میں پانچ وقت فرض قرار دی گئی ہے۔ نماز ذکر و فکر کی بنیاد قائم کرتی ہے اور اس کے ذوق و شوق کی پرورش کرتی ہے۔ جب ذکر' فکر کا ہمدوش ہو یعنی وہ سچے احساس حسن کا نتیجہ ہو اور انتہائی اخلاص پر مبنی ہو تو اس میں خشوع اور خضوع' محبت اور فریفتگی اور عجز و انکسار کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ سچی محبت کرنے والا ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہتا ہے' اس لئے حضور نے فرمایا: **الایمان بین الخوف والرجاء**۔ اسے خوف تو اس بات کا ہوتا ہے کہ مبادا محبوب کی محبت اس سے چھن جائے' وہ کوئی بات نہ کر بیٹھے جس کا نتیجہ اس کی ناراضگی ہو۔ اسے محبوب کی ناراضگی کا ڈر اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ اسے کوئی سزا دے گا' بلکہ وہ خود اس کی ناراضگی کو ہی سب سے بڑی سزا سمجھتا ہے' یہی اس کی دوزخ ہے۔ اور اسے امید اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبت اور اطاعت محبوب کی مزید رضامندی کا موجب ہوگی اور وہ اس کی رضامندی کا طالب اس لئے نہیں ہوتا کہ اس سے کوئی انعام حاصل کرے گا' بلکہ وہ خود اس کی رضامندی کو ہی سب سے بڑا انعام سمجھتا ہے' یہی اس کی جنت ہے۔ **ورضوان من اللہ ذالک اکبر لو کانوا یعلمون** (اور اللہ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے اگر وہ سمجھیں۔) خدا کی رضامندی آنکھوں کی وہ ٹھنڈک ہے جس کی لذت کا اندازہ ہم اس وقت نہیں کر سکتے۔۔۔ **فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین**۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں شہدا خدا سے التجا کریں گے کہ اے خدا ہمیں دنیا میں پھر بھیج تاکہ ہم تیری راہ میں پھر شہید ہوں اور تو ہم پر خوش ہو۔ اہل جنت کو جنت میں داخل ہوتے وقت جس نعمت کی بشارت دی جائے گی وہ یہ ہوگی کہ خدا ان سے راضی ہے۔ **یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** (اے نفس مطمئنہ! لوٹ چل اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر۔ پھر داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔)

عبادت میں عجز و انکسار' جو قرب حسن کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے' مومن کی خودداری کو شکستہ نہیں کرتا' اسے قائم کرتا ہے کیونکہ جس قدر وہ عجز کرتا ہے' اسی قدر اسے معبود کی عظمت اور کبریائی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس معرفت کی وجہ سے وہ خود محبوب کی کبریائی سے حصہ لیتا ہے اور اس کی خودداری اور خود اعتمادی ترقی کرتی ہے۔

مومن اللہ کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے' لیکن غیر اللہ کے سامنے سرکش' کیونکہ اسے اپنی اس

طاقت کا علم ہوتا ہے جسے وہ محبوب کی دوستی سے حاصل کرتا ہے۔

خویش را درباز و خود را بازگیر

دام گستر از نیاز و نازگیر

(اپنے آپ میں جھانک اور اپنے آپ کو پالے۔ نیاز کا جال پھیلا اور ناز سے ہمکنار ہو جا۔)

خدا کی حمد و ستائش، تحسین و تسبیح اور تقدیس و تہلیل ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ صرف وہی ذکر جو سچے احساس حسن کا نتیجہ ہو، یعنی جس میں خشوع و خضوع، تضرع اور ابتہال، سوز و گداز اور بیم و رجا کے عناصر موجود ہوں، مومن کے احساس حسن کو عمیق تر اور قوی تر کرتا ہے اور اس کی محبت اور معرفت کو ترقی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہم سے عبادت میں اخلاص طلب کرتا ہے اور فقط زبان سے چند کلمات کی تکرار طلب نہیں کرتا۔

لایاتون الصلوۃ الا وھم کسالی (وہ نماز کے قریب نہیں آتے مگر سستی کے ساتھ) **ولاینفقون الاوھم کارھون** (اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ) **فاعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین** (پس اللہ کی عبادت کرو اس کے دین کے لئے مخلص ہو کر) **فادعوا اللہ تضرعا وخیفتہ** (پس اللہ کو پکارو عاجزی اور خوف کے ساتھ) **قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون** (فلاح پا گئے مومن جو اپنی نمازوں میں اللہ سے ڈرتے ہیں) **الذین یدعون ربھم رغبا ورھبا و کانوا لنا خاشعین** (جو اپنے رب کو پکارتے ہیں رغبت اور خوف سے اور وہ ہم سے ڈرنے والے ہیں۔)

حسن عبادت کا ذکر حضورؐ کی اس دعا میں ہے: **اللھم اعنا علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک** (اے اللہ! مجھے اپنے ذکر، اپنے شکر اور حسن عبادت پر کاربند رکھ۔) عبادت وہی ہے جس میں اخلاص موجود ہو۔ محبت کی ترقی کا انحصار مخلصانہ عبادت میں ہے اور خدا کے نزدیک سچا مومن وہی ہے جو خدا سے شدید محبت رکھتا ہے۔ **والذین امنوا اشد حباللہ** (اور جو ایمان لاتے وہ اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔) ان آیات سے مخلصانہ عبادت کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اس قسم کی شدید محبت جو ایک سچے مومن کا امتیاز ہے، پیدا کرنے سے قاصر رہ جائیں تو پھر ہم وہ کام بھی نہیں کر سکتے جو خدا کے نائبوں کی حیثیت سے ہمارے سپرد کیا گیا ہے یعنی تربیت انسانیت۔ **وکنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر** (اور تم بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے پر مامور ہوئی ہے۔) اس قسم کی شدید محبت ہی ہماری اپنی اصلاح کی ضمانت ہے اور ہمیں دوسروں کی اصلاح کی خاطر قربانیاں کرنے کے لئے آمادہ کر سکتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ہم خدا کی محبت کے حقدار نہیں

ہو سکتے بلکہ وہ ہمیں زندہ رہنے کا حقدار بھی نہیں سمجھتا اور اس بات پر آمادہ ہے کہ ہمیں مٹا کر ہماری جگہ کوئی اور قوم دنیا میں لے آئے جو اس سے محبت کرتے ہوں اور جن سے وہ محبت کرتا ہو۔ یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ لایخافون لومۃ لائم (اے ایمان والو! تم میں سے اگر کوئی اللہ کے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک ایسی قوم کو تمہاری جگہ لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ مومنوں کے لئے نرم اور کافروں کے لئے سخت ہیں' اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور وہ کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔)

احساس حسن میں ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے۔ جوں جوں ذکر و فکر سے مومن کا احساس حسن ترقی کرتا ہے' یہ لذت بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے مومن کا یقین اور اطمینان قلب اور ترقی کرتا ہے۔ اس لذت اور اطمینان قلب سے مومن صراط مستقیم کا ذاتی تحقق اور اس کی دلی تصدیق کرتا ہے اور اس پر قائم رہتا ہے۔ الذین امنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الابذکر اللہ تطمئن القلوب (جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ آگاہ رہو اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔) خدا کے ذکر سے مومن کو جو غیر معمولی اطمینان قلب اور سرور حاصل ہوتا ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا ذکر انسان کی ایک شدید فطرتی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کی ہر فطرتی ضرورت کی تکمیل میں ایک لذت رکھی ہے خواہ وہ ضرورت حیاتیاتی سطح پر ہو یا نفسیاتی سطح پر' یہ لذت ضرورت کی تکمیل کے لئے راہنمائی کرتی ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ سلم نے ذکر و فکر کی ایک قلیل ترین صورت نماز کی شکل میں معین فرما دی ہے لیکن محبت کے کمال یا روحانی ارتقاء کے بلند ترین مقامات تک پہنچنے کے لئے' جو در حقیقت مومن کا مقصود ہے' جس قدر ذکر و فکر کی ضرورت ہے وہ سب کا سب نماز سے میسر نہیں آتا۔ اس لئے مومن کے لئے ضروری ہے کہ نماز کے علاوہ بھی کثرت سے ذکر و فکر میں مشغول رہے ورنہ وہ اپنے مقصود کو نہیں پا سکے گا۔ فاذا قضیتم الصلوۃ فاذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون (پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ) --- الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم (جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے) --- فاذکروا اللہ کثیرا کذکرکم اباء کم او اشد ذکرا (پس تم اللہ کا ذکر کثرت سے کرو جیسے تم اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ کرو۔)

اظہارِ جمال

احساس حسن سے جو عمل پیدا ہوتا ہے اس کی دوسری قسم اظہار جمال ہے یعنی اپنے اخلاق میں حق تعالیٰ کی صفات کا اظہار کرنا۔ خدا کی ربوبیت کا اقرار مومن کو خدا کی حمد و ستائش پر ہی مائل نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کے ہر فعل کی نوعیت کو معین کرتا ہے۔ نماز اور ذکر اور فکر کے ذریعہ سے مومن اپنے احساس حسن کے عملی اظہار کا ایک طریقہ اختیار کرتا ہے لیکن اسی احساس حسن سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس کا اظہار ایک طریق سے نہیں' بلکہ ہر ممکن طریق سے کرے۔ پس وہ اپنے شب و روز کے سارے اعمال و افعال میں بھی اس کا اظہار کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اوصاف باری تعالیٰ کے حسن سے آشنا ہی نہیں اور اس کے دل میں ان کے جمال کا احساس یا ان کی کشش موجود ہی نہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص رحم' ربوبیت' محبت' انصاف' صداقت' غیرت وغیرہ اوصاف کے حسن کا احساس تو رکھتا ہو لیکن اپنے فعل و کردار میں انصاف کی بجائے بے انصافی' ربوبیت کی بجائے استیصال' رحم کی بجائے ظلم' محبت کی بجائے نفرت' صداقت کی بجائے جھوٹ اور غیرت اور حمیت کی بجائے بے غیرتی اور بے حمیتی کو اپنا شعار بنائے۔ جو شخص خدا کے اوصاف سے محبت کرتا ہے' ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام افعال میں ان کا اظہار کرے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو ان اوصاف کی محبت اور معرفت میں اور ترقی حاصل کرتا ہے کیونکہ یہ نفسیات انسانی کا ایک اٹل قانون اور فطرت انسانی کا ایک دائمی تقاضا ہے کہ ہر احساس اظہار سے قوی تر ہوتا ہے اور اظہار کے بغیر اور کمزور ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے' اس کے لئے دوسری نیکی کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔
ایک ظالم انسان اگر ایک دفعہ انصاف کی طرف رغبت کرے تو دوسری دفعہ انصاف کی طرف مائل ہونا اس کے لئے اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جو شخص احساس حسن سے بہرہ ور ہے اور ذکر و فکر کے ذریعہ سے اس کا اظہار کرتا ہے لیکن اپنے دن رات کے سارے اعمال و افعال میں اس کا اظہار نہیں کرتا' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دن بھر میں ایک دو گھنٹے تو اپنی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھائے لیکن باقی تمام دن مخالف سمت میں چلتا رہے۔ وہ کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچے گا بلکہ ہمیشہ اس سے دور تر ہوتا جائے گا۔ پس ضروری ہے کہ خدا کو محبوب اور معبود تسلیم کرنے کے بعد مومن کا سارا عمل ان اخلاقی اصولوں کے تابع ہو جائے جو خدا کی صفات جمال و جلال سے ماخوذ ہیں۔

اخلاقی اصولوں کی ایسی پیروی کہ اس میں کبھی غلطی یا لغزش کا امکان باقی نہ رہے'

ابتداء ہی سے ممکن نہیں ہوتی بلکہ اس وقت ممکن ہوتی ہے جب مومن کی محبت ترقی کر کے اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ ذکر و فکر کی کثرت سے جب مومن کی محبت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے تو اس ترقی یافتہ محبت کی وجہ سے اخلاقی اصولوں کی پیروی اس کے لئے کچھ اور آسان ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا عمل اسے صفات حسن کے اور قریب لے آتا ہے اور اس کے احساس حسن کو عمیق تر اور قوی تر بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ ذکر اور فکر میں مشغول ہوتا ہے تو اسے اس میں پہلے سے بھی زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے اور یہ ذکر و فکر چونکہ اس کی ترقی یافتہ معرفت جمال کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس کی محبت اور معرفت کی ترقی کے لئے اور بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ محبت کی یہ ترقی اس کے عمل میں عمدگی، پاکیزگی اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح حسن اخلاق اور ذکر و فکر، دونوں ایک دوسرے کی تائید اور اعانت کرتے ہوئے مومن کی محبت کو نقطہ کمال پر پہنچاتے ہیں۔

جب مومن کی محبت اپنی انتہا کے قریب پہنچتی ہے تو اس کا سرور یا اطمینان قلب بھی اپنی انتہا کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسی سرور یا اطمینان قلب سے مومن کی جنت کا آغاز ہوتا ہے۔ اپنے اطمینان قلب کی آخری منزلوں پر پہنچنے کے بعد جب مومن ذکر و فکر میں مشغول ہوتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ خداوند تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ درجہ احسان ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے: **ان اللہ یحب المحسنین۔** ۔ اور جس کا ذکر حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمایا: **الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ** (احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔) جس قدر مومن کی محبت زیادہ ہوگی، اسی قدر اس کا نظارہ جمال بھی واضح اور روشن اور باعث ازدیاد لذت و سرور ہو گا۔

مومن جب اپنی محبت کے نقطہ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اپنے جذبہ محبت کو اپنے اطمینان قلب کی خاطر اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ خلقت کی اصلاح کے لئے کام میں لاتا ہے کیونکہ شدت محبت ایک بے پناہ قوت عمل ہے جو رک نہیں سکتی اور جو لازماً اپنے اظہار اور استعمال کے لئے میدان عمل تلاش کرتی ہے اور اس کا میدان اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا کہ مومن خدا سے برگشتہ انسانوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ اس غرض کے لئے وہ اپنی صفات جمال و جلال کو، جو خدا کی صفات جمال و جلال کا پرتو لئے ہوئے ہوتی ہیں، کام میں لاتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے وہ محبت اور نرمی سے کام لیتا ہے لیکن جب ضرورت پڑے تو نفرت اور سختی کا برتاؤ بھی کرتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کی صفات سے متصف اور اس کے اخلاق سے متخلق ہوتا ہے وہ ان صفات کو

اسی طرح کام میں لاتا ہے جس طرح خود خدا اپنی صفات کو کام میں لاتا ہے۔ اسی لئے وہ خدا کا نائب اور خلیفہ قرار پاتا ہے۔ وہ خدا کی تخلیق اور تربیت کا آلہ کار بنتا ہے اور خدا کی تخلیق اور تربیت اس کی تخلیق اور تربیت کا جامہ اوڑھتی ہے۔ وکنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (اور تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔) اور خدا کی تعذیب اور سزا اس کی تعذیب اور سزا کا روپ دھارتی ہے۔ ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (اور جب آپ نے تیر پھینکا تو وہ آپ نے نہیں پھینکا تھا بلکہ اللہ نے پھینکا تھا۔) یرید اللہ لیعذبھم باید یکم (اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھوں انہیں عذاب دے۔) انسانیت کی خدمت اور تربیت کے کام سے مومن کی محبت اور ترقی کرتی ہے یہاں تک کہ وہ پوری طرح پختہ اور راسخ ہو جاتی ہے۔

کیا خدا کو دیکھنا ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں رویت کی حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ جب ہم کسی مادی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس پر نظر ڈالنے اور رویت کا احساس کرنے تک جو عمل معرض وجود میں آتا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

کسی چیز پر سے جو روشنی کی شعاعیں بکھر رہی ہوتی ہیں وہ ہماری آنکھوں پر پڑتی ہیں۔ ہماری آنکھوں کا محدب شیشہ انہیں سمیٹ کر اس چیز کا ایک عکس بناتا ہے جس کی اطلاع عصب رویت کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ کی معرفت ہمارے شعور کو اس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا جو چیز خارج میں موجود کسی جسم کو دیکھتی ہے وہ دراصل ہمارا شعور ہی ہے اور ہمارا شعور بھی جو چیز دیکھتا ہے وہ خود جسم نہیں ہوتا بلکہ اس جسم کے چند اوصاف ہوتے ہیں جن کے مجموعہ کو ہم وہ جسم قرار دیتے ہیں۔ دماغ، عصب، رویت، آنکھ اور روشنی فقط ان اوصاف کا علم حاصل کرنے کے آلات ہیں جن کو ہمارا شعور اپنے کام میں لاتا ہے۔ جب شعور کو ان اوصاف کا واضح علم حاصل ہو جاتا ہے تو خواہ وہ جسم آنکھوں کے سامنے رہے یا نہ رہے، شعور اجاگر ہے تو اس کو پھر دیکھ سکتا ہے اور جس قدر شعور کا علم واضح ہوگا اسی قدر اس کی بلاواسطہ رویت جسم بھی واضح ہوگی۔

جب مومن کے دل میں مطالعہ جمال اور مظاہرہ جمال سے حق تعالیٰ کے اوصاف کی محبت درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو شدت محبت کی وجہ سے ذکر و فکر کے دوران میں مومن کی ساری توجہ ان اوصاف پر مرکوز ہو جاتی ہے، وہ اوصاف اس کے شعور پر چھا جاتے ہیں اور ان کا علم اس کے شعور پر پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے۔ اس وقت مومن کا شعور حق تعالیٰ کو بالکل اس طرح دیکھتا ہے جس طرح اس دنیا کی کسی اور چیز کو دیکھنا اس کے لئے ممکن ہوتا ہے۔ چونکہ یہ رویت ان آنکھوں سے

نہیں ہوتی جو مادی اجسام کے دیکھنے کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر بنائی گئی ہیں' اس لئے حدیث کے الفاظ ہیں کانک تراہ (گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے) یعنی وہ دیکھتا تو ہے' لیکن یہ دیکھنا آنکھوں کے ذریعے سے عمل میں نہیں آتا۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ہم خدا کو روبرو نہ دیکھیں' ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے' حالانکہ ایمان لانا خدا کو دیکھنے کی پہلی شرط تھی۔ اس کٹ حجتی پر ان کو سزا دی گئی۔

مطالعہ اور مظاہرہ جمال سے مومن کی محبت کی تدریجی ترقی کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کے دل میں تصور کامل کی محبت ترقی کرتی جاتی ہے' ناقص تصورات کی محبت اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب تصورات ناقصہ کی محبت بالکل مٹ جاتی ہے تو تصور کامل کی محبت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ درحقیقت مومن کے سامنے سارا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ تصورات باطلہ کی محبت بالکل مٹا دے۔ خدا کے انبیاء کی تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ مومن کو اس کی اس جدوجہد میں امداد بہم پہنچائی جائے۔ غلط محبت کے مٹ جانے سے انسان کی فطرتی استعداد محبت صحیح اور کامل تصور کے لئے مہیا ہو جاتی ہے' لہٰذا کامل تصور کی محبت فوراً اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اگر غلط محبتیں دل میں موجود رہیں تو صحیح محبت کو یہ عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر صحیح اور کامل تصور کی محبت ترقی نہ کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی بعض غلط تصورات کی محبت مومن کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی موجود ہے اور ابھی وہ شرک میں مبتلا ہے۔ ایسی حالت میں مومن کو اور زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

آپ پوچھیں گے کہ تصورات ناقصہ کی محبت مومن کے دل میں کیوں موجود ہوتی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ تصورات ناقصہ وہ تصورات ہیں جو تصور کامل کے علم کی عدم موجودگی میں انسان کے دل پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس کی فطرتی استعداد محبت کو جو درحقیقت تصور کامل کے لئے مخصوص ہے' اپنے کام میں لے آتے ہیں۔ انسان جو یوں گمراہ ہو جاتا ہے' اپنے فطرتی جذبہ محبت کی تشفی کے لئے غلط تصور سے وہ تمام صفات جمال منسوب کرتا ہے جن کا مالک درحقیقت اللہ ہی ہے' لہٰذا وہ اس سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح اسے اللہ سے محبت کرنی چاہئے۔ واتخذوا من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ (اور انہوں نے اللہ کے سوا اس کے شریک بنا لئے' ان سے وہ اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت ہونی چاہئے۔)

چونکہ انسان کا تصورِ حسن ہی اس کے سارے اعمال و افعال کو پیدا کرتا ہے' اس لئے اگر کوئی انسان کچھ عرصہ کے لئے ایک ناقص تصور کے ساتھ وابستہ رہے تو اس کی محبت کے اثر کے ماتحت وہ اس کی طرف رغبت کی ایک عادت بنا لیتا ہے۔ غلط تصور سے غلط عادات پیدا ہوتی ہیں جو غلط تصور کی محبت کو قائم رکھتی ہیں۔ انسان اس بات کے باوجود کہ وہ فطرتاً" نیکی' صداقت اور حسن و کمال کا دلدادہ ہے' غلط تصور کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی باطل تصور کلیتہ" باطل سے نہیں ہوتا' بلکہ ہر غلط تصور' حق و باطل کی آمیزش سے بنتا ہے' اس لئے باطل ہوتا ہے۔ اس میں ایک شائبہ نیکی' صداقت یا کسی اور صفت جمال کا موجود ہوتا ہے جس سے انسان کی فطرت دھوکہ کھاتی ہے اور اسے تصور کامل سمجھ کر قبول کرتی ہے۔ جب ایک انسان خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے تو اس کا یہ اقرار ان تمام تصورات باطلہ کے لئے موت کا پیغام ہوتا ہے جن سے وہ آج تک اپنی تمنائے حسن و کمال کو بہلاتا رہا تھا۔ لیکن تصورات باطلہ جو اپنی پیدا کی ہوئی عادات کے اندر جڑ پکڑ چکے ہوتے ہیں' آسانی سے اس کے دل کو خالی نہیں کرتے اور اس کی محبت کی استعداد کو فوراً کلیتہ" رہا نہیں کرتے کہ مومن اسے فی الفور تصور کامل کے لئے کام میں لا سکے۔ پھر رفتہ رفتہ ذکر اور فکر اور سعی و عمل سے جوں جوں مومن کی حقیقی محبت ترقی کرتی ہے' اس کے اندر نئی عادات پیدا ہوتی ہیں جو صحیح ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے پرانی غلط عادات کا عمل رک جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر مٹ جاتی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نیک اعمال کو متواتر اور باقاعدگی سے جاری رکھا جائے تاکہ انسان کو ان کی عادت ہو جائے اور برے اعمال کو اور ان کے ساتھ برے تصورات کو قائم رہنے اور بڑھنے اور پھولنے کا موقع نہ ملے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

> اچھے اعمال وہ ہیں جنہیں باقاعدگی سے جاری رکھا جائے اور نماز کو فرض موقت بھی اسی لئے قرار دیا گیا ہے--- ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتابا" موقوتا" (درحقیقت نماز مومنوں پر فرض ہے مقررہ اوقات میں۔)

تصورات باطلہ کی غیر معمولی قوت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اکثر ہماری حیوانی جبلتوں' حیاتیاتی سطح کی خواہشات یا نچلے طبقے کی خواہشات کے اردگرد قائم ہوتے ہیں۔ ہماری فطرت کی وہ قوت محبت جو تصور حسن و کمال کے لئے مخصوص ہے' جب ایک غلط راستہ اختیار کرتی ہے تو اکثر حیوانی جبلتوں کی تسلی اور تشفی کی لذت کو ہی حسن و کمال کی انتہا قرار دے لیتی ہے۔ گویا ہماری جبلتی خواہشات ہی ہمارے تصور حسن کی صورت میں جلوہ افروز ہو جاتی ہیں۔ جب یہ صورت حال

پیدا ہوتی ہے تو انسان ان خواہشات کو ان کے فطرتی مقصد یعنی بقائے فرد و نسل کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اپنی ساری زندگی ان کی تسلی اور تشفی کی لذت کے لئے مخصوص کر دیتا ہے۔ اس سے کوئی اعلیٰ تر تصور حسن اس کے ذہن میں نہیں آتا اور وہ کسی اعلیٰ تر تصور حسن کا احساس کرنے کی اہلیت ہی کھو دیتا ہے۔ انسان کی یہ زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہوتی ہے' انسانی درجہ کی زندگی نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورت میں انسان حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ حیوان اپنی جبلتی حیاتیاتی خواہشات کو کبھی ضرورت سے زیادہ مطمئن نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے **ھم کالانعام بل ھم اضل** (وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔) ایسے لوگوں کا خدا' گویا ان کی سفلی خواہشات ہی ہیں۔ **افرایت من اتخذ الھہ ھواہ** (کیا تو نے دیکھا اسے جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا؟) جب انسان کی جبلتی خواہشات اس کے تصورات جمال کا درجہ اختیار کرتی ہیں تو وہ اور بھی طاقتور ہو جاتی ہیں کیونکہ پھر وہ انسان کی اس محبت سے قوت حاصل کرتی ہیں جو انسان کی فطرت میں تصورات کے لئے مخصوص ہے۔ اس صورت میں تصور کامل کی محبت کی ترقی کے لئے ان خواہشات کا مقابلہ کر کے ان کو اپنے دائرہ کے اندر محدود کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے' تاہم مرد مومن کی جدوجہد اس کو آسان بناتی ہے۔

مرد مومن زندہ و باخود بجنگ
برخود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

(مرد مومن زندہ اور اپنے آپ سے برسرپیکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر اس طرح جھپٹتا ہے جیسے چیتا ہرن پر۔)

صوم یا روزہ کا فلسفہ یہی ہے کہ مومن اپنی محبت میں جبلتی خواہشات کی مداخلت کا مقابلہ کرنے کی مشق حاصل کرے اور بالاخر ان پر فتح پائے اور ان کو بقائے حیات کی ضرورت کے دائرہ تک محدود کر دے تاکہ وہ تجاوز کر کے تصور کی محبت سے حصہ نہ لیں۔ روزہ رکھنے سے ایک ٹریننگ حاصل ہوتی ہے جس سے تصور کامل کی محبت کے راستے سے رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور وہ ترقی کر کے اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ تزکیہ نفس کے معنی یہی ہیں کہ انسان باطل تصورات کی محبت سے' جس میں جبلتی خواہشات کی محبت بھی شامل ہے' اپنے شعور کو پاک کرے۔ جب تک شعور ان خواہشات سے پاک نہ ہو گا' محبت کی استعداد بے محل صرف ہوتی رہے گی۔ تصور کامل کی محبت اور معرفت کی ترقی رکی رہے گی اور مومن کو مکمل اطمینان قلب حاصل نہ ہو گا۔ **قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا** (فلاح پائی اس نے جس نے تزکیہ اختیار کیا اور نامراد ہوا جس نے اپنے نفس کو خاک میں ملا دیا۔) **ونھی النفس عن الھوی فان الجنتہ ھی الماوی** (اور مومن وہ ہے

جس نے اپنے نفس کو خواہشات کی پیروی سے روکا' پس جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔) یہی نہیں کہ جبلتی خواہشات تصور کی محبت چھین لیتی ہیں اور مومن کو ضرورت ہے کہ وہ انہیں ان کے دائرہ کے اندر محدود کرے بلکہ بعض وقت تصور کو اس بات کی ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے ان میں سے بعض خواہشات کو ان کے اندرونی دباؤ کے باوجود روک دے' مثلاً جنگ میں جب تصور کی ضروریات کی خاطر' بھوک' پیاس یا جنسی خواہشات کو روکنا پڑتا ہے بلکہ خود زندگی کو' جس کی بقا کے لئے یہ خواہشات موجود ہیں' قربان کرنا پڑتا ہے۔ صوم اس قسم کے نازک حالات میں تصور کی محبت کو غالب رکھنے کے لئے مومن کی تیاری ہے۔

اس دنیا میں مومن کی محبت اسی حد تک ترقی کرتی ہے جس حد تک کہ وہ اس ترقی کی استعداد رکھتا ہو اور یہ استعداد اس کی دماغی صلاحیتوں پر موقوف ہے کیونکہ دماغ شعور کا آلہ ہے' گویا محبت کی استعداد مختلف انسانوں میں ان کی ذہانت کی نسبت سے مختلف ہوتی ہے۔ جو شخص ایک ناقص تصور سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کرنے کی استعداد رکھتا ہے' وہی تصور کامل سے بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ محبت کر سکتا ہے۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ تصور کامل کے ساتھ اس قدر محبت پیدا کرے جس قدر اس کی فطرتی استعداد اجازت دیتی ہے۔ جب تک وہ ایسا نہیں کرتا اس وقت تک یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی محبت سو فیصد مخلصانہ نہیں اور اسے محبت میں یک سوئی اور یک بینی حاصل نہیں ہوئی' اس کی محبت میں شرکت غیر کا شائبہ ہے اور کوئی باطل تصور ایسا ہے جو ابھی اس کی محبت کی استعداد کو غلط طریق سے مصروف رکھتا ہے۔ لیکن جب مومن اپنی استعداد کے مطابق محبت کے کمال پر پہنچ جائے تو اسے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس نے خدا کو پوری طرح سے جان لیا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ماعرفناک حق معرفتک** (اے اللہ! ہم تیری معرفت کماحقہ حاصل نہیں کر سکے) تو اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی معرفت حق مکمل ہو گئی؟

خدا کے حسن و جمال کی کوئی انتہا نہیں کہ ہم اس انتہا کو پا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی محبت اور معرفت کی ترقی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ جنت میں اہل جنت کی پکار ہوگی: **ربنا اتمم لنا نورنا** (اے ہمارے رب! ہمارا نور مکمل کر دے۔) لیکن جنت میں مومن کی ترقی کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹیں حائل نہیں ہوں گی جن کو راستے سے ہٹانے کی جدوجہد کرنے کی ضرورت محسوس کرے اور پھر اس میں کبھی کامیاب رہے اور کبھی ناکام۔ معرفت کے جس معیار کو وہ دنیا میں حاصل کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کے اندر یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی محبت خود بخود ترقی کرتی رہے اور وہ ہر آن حق تعالیٰ کے حسن و جمال کی تازہ جھلک دیکھتا رہے۔ اب نہ تو اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ محبوب کی محبت اس سے باز رہے گی اور نہ کبھی اس بات کا غم لاحق ہوتا ہے

کہ اس کی کسی لغزش یا خطا کے باعث وہ در حقیقت باز رہ گئی ہے۔۔۔ **لاخوف علیھم ولاھم یحزنون** (انہیں کوئی خوف ہو گا نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔) انسان کی جو منزل اس کی فطرت کی رو سے قرار پائی ہے جب تک وہ نہ آ جائے، وہ مجبور ہے کہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہے۔ انسان کی منزل مقصود خدا ہے۔ لہٰذا محبت کا ارتقاء موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔۔۔ **والی ربک المنتھی** (اور آخر کار پہنچنا تیرے رب کے پاس ہے۔)

جو لوگ انبیاء کی تعلیم پر ایمان نہیں لاتے وہ غلط تصورات سے اپنی محبت کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ لہٰذا خواہ وہ زندگی میں کتنی ہی تگ و دو کریں اور اپنے غلط تصور کی کتنی ہی خدمت یا عبادت کریں وہ ذرہ بھر اپنی منزل مقصود کے قریب نہیں آتے بلکہ وہ اپنے غلط عمل کے باعث اس سے پیہم دور ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ **والذین کفروا اعمالھم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا علی شی** (اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال راکھ کے مانند ہیں جسے آندھی والے دن تیز ہوا لے اڑے۔ جو کچھ انہوں نے کمایا اس پر وہ کوئی اختیار نہیں رکھتے۔)۔۔۔۔ **حبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیامتہ وزنا**" (ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ پس ہم روز قیامت ان کے لئے وزن قائم نہ کریں گے۔) بعض وقت ان کی آنکھیں دنیا ہی میں کھل جاتی ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا معبود صفات حسن و جمال سے عاری ہے اور وہ اپنی گزشتہ زندگی سے انحراف کر کے ایک نئے معبود یا نئے تصور کو اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پچھلی جدوجہد سب بے فائدہ تھی لہٰذا وہ خود اپنے سارے گزشتہ اعمال کو مردود اور بیکار سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں بلکہ نئے تصور کے تقاضوں کے مطابق ان کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر نیا تصور بھی پہلے تصور ہی کی طرح غلط ہو اور وہ اسی پر مر جائیں تو پھر ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ان کے غلط اعمال اور غلط عبادتیں ان کو اپنی فطرت کی مقرر کی ہوئی منزل کی طرف قدم اٹھانے میں کوئی مدد نہیں دیں گی بلکہ ان کی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ بن جائیں گی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے اعمال کے ساتھ ایک کش مکش میں مصروف ہوں گے تاکہ ان کے روکنے والے اور مزاحمت کرنے والے اثرات سے نجات پا کر نئے سرے سے اپنی منزل کی راہ اختیار کر سکیں "گویا وہ غلط راستے پر جس قدر آگے جا چکے تھے اسی قدر اس راستے پر انہیں واپس آنا پڑے گا" تب وہ صحیح راستے پر پہلا قدم رکھ سکیں گے۔ وہ جہاں سے پھسلے تھے' ان کو پھر وہیں پہنچنا ہو گا تاکہ وہاں سے آگے قدم اٹھا سکیں۔

ظاہر ہے کہ اپنے غلط اعمال کے ساتھ یہ کشمکش اور اپنے غلط راستے پر قدم بقدم واپسی ایک نہایت ہی اندوہ ناک عمل ہو گا جو محبوب کے ہجر کے احساس کی وجہ سے اور بھی زیادہ حزن و ملال کا

موجب ہو گا۔ دوزخ کے عذاب کا ایک پہلو یہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن کی جنت کی طرح کافر کی دوزخ کی ابتداء بھی دنیا ہی میں ہوتی ہے۔ مومن دنیا ہی میں اطمینان قلب پالیتا ہے اور کافر کو دنیا ہی میں خوف و ہراس دامن گیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح مومن کی جنت کی نعمتیں اگلی دنیا میں پہنچ کر کئی گنا بڑھ جاتی ہیں' اسی طرح کافر کی دوزخ کی محرومیاں اگلی دنیا میں پہنچ کر کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ دنیا جس طرح مومن کے اطمینان قلب کو مکمل نہیں ہونے دیتی' اسی طرح کافر کے خوف و ہراس کو بھی مکمل ہونے نہیں دیتی۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا ہے: **الدنیا سجن المومن وجنته الکافر** (دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔)

اس دور میں تجزیہ نفس کے ماہرین (Psycho- analysts) نے فطرت انسانی کے متعلق جو تحقیقات کی ہے اس کی رو سے یہ امر قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بچپن سے لے کر مرتے دم تک ہر کام جو انسان کرتا ہے خواہ وہ اس کی نظروں میں کتنا ہی غیر اہم اور ناقابل اعتنا ہو' انسان کے لاشعور (Unconscious) میں کالنقش فی الحجر محفوظ رہتا ہے۔ وقت کے گذرنے سے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور وقت اور فاصلہ کے قوانین بھی اس پر اثرانداز نہیں ہوتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شعوری طور پر انسان واقعات کو فراموش کر دیتا ہے' لیکن لاشعور انہیں ہمیشہ اور جوں کا توں یاد رکھتا ہے۔

انسان کا لاشعور گویا اس کے سارے افعال و اعمال کا ایک ناقابل محو ریکارڈ ہے۔ ہم جب چاہیں معمول پر ہپناٹک نیند طاری کر کے اس کے ریکارڈ کے کسی حصہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس ریکارڈ کی موجودگی کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارے روزمرہ کے خوابوں کا تار و پود تیار ہوتا ہے۔ انسان کا لاشعور گویا اس کا اعمالنامہ ہے جو اس کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے اور ہر روز لکھا جاتا ہے' اس سے انسان کا چھٹکارا نہیں۔ یہی اس کی قسمت کی نحوست اور سعادت کو معین کرتا ہے۔ **وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ** (اور ہر انسان کی نحوست ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دی ہے۔)

انسان کے لاشعور کا یہ خاصہ قرآن کے ارشادات کی تصدیق کرتا ہے--- **ان علیکم لحافظین کراما" کاتبین یعلمون ماتفعلون** ○ (بے شک تم پر دیکھ بھال کرنے والے مقرر کئے گئے ہیں۔ معزز لکھنے والے جو تمہارے کاموں کو جانتے ہیں۔) موت کے بعد انسان کا یہ اعمالنامہ اس کے سامنے آجائے گا تاکہ وہ اس کی جزا اور سزا خود پالے۔ اور وہ اسے پڑھ پڑھ کر حیران ہو گا کہ اس کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا عمل' اچھا یا برا' ایسا نہیں جو اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہو--- **مالھذا الکتاب لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا**

احصاھا (یہ کیسی کتاب ہے جو چھوٹا بڑا کوئی عمل نہیں چھوڑتی مگر شمار کرتی ہے)-- ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا" یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا" یرہ (جس نے ذرہ برابر نیکی کی اس کا اجر پالے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی' اس کا بدلہ پالے گا۔)

اس بات کے باوجود کہ انسان کے دماغ اور سارے جسم کے مادی ذرات اور سالمات پے درپے بدلتے رہتے ہیں' انسان کے لاشعوری اعمالنامہ کا غیر متغیر حالت میں موجود رہنا اور پھر وقت اور فاصلہ کے ان قوانین کی زد سے باہر ہونا جو اس مادی دنیا میں نافذ ہیں' اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا شعور جو اصل انسان ہے ایک ایسی چیز ہے جو جسم کے تغیرات' حتیٰ کہ جسم کے فنا سے بالاتر ہے اور اگلی دنیا میں جہاں وقت اور فاصلہ کے قوانین رائج نہیں' زندہ رہ سکتا ہے۔ انسان کے اعمال کا ریکارڈ اس کے شعور ہی کا حصہ ہے۔ یہ ریکارڈ اور جو چیز اس کو محفوظ کرتی ہے' خود انسان ہی ہے' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا اگر یہ ریکارڈ مادی حالات سے بے نیاز ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے تو انسان بھی مادی دنیا کے بغیر محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس ریکارڈ کا محفوظ رہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت کے نزدیک اس کا کوئی مصرف اور مدعا ہے جو اگلی دنیا میں تکمیل پائے گا۔

انسان کی فطرت کا یہ تقاضا کہ اسے ہر حالت میں اپنی روحانی ترقی کی انتہا تک پہنچنا چاہیے' اس مدعا پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ باور کرنے کے لئے ایک معقول وجہ مہیا کرتا ہے کہ موت کے بعد جن لوگوں کے اعمال اچھے ہوں گے' یعنی ان کی منزل مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والے ہوں گے وہ تو آسانی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے اور جنت میں ہوں گے اور جن لوگوں کے اعمال برے ہوں گے یعنی انہیں اپنی فطرت کی مقرر کی ہوئی منزل مقصود سے ہٹانے والے ہوں گے وہ ان کے اثرات سے پاک ہونے کے لئے ایک خوفناک جدوجہد میں مصروف رہیں گے اور دوزخ میں ہوں گے۔ ہر شخص اپنی دوزخ اور جنت اس دنیا میں بناتا ہے اور اگلی دنیا میں اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں یہ بتانے کی گنجائش نہیں کہ کس طرح جنت کی حوریں اور نہریں اور دوزخ کی آگ اور زقوم اور ماء حمیم محض استعارات نہیں بلکہ اسی طرح کی سچ مچ کی چیزیں ہوں گی جیسی کہ ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں۔

چونکہ عمل محبت کی ترقی کا ایک ذریعہ ہے' مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل کے میدان کو تنگ نہ ہونے دے بلکہ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اسے پوری وسعت دے۔ فطرت انسانی کی ضروریات کے مطابق عمل کے میدان کی توسیع اور تقویم خود ایک عمل ہے جو محبت کو ترقی دیتا ہے۔ انسان کا میدان عمل صفات ربانی کی جلوہ گاہ ہے۔ اسے محدود کرنا ظہور صفات کو محدود کرنا ہے۔ رہبانیت عمل کے میدان کو محدود کرتی ہے' اس لئے وہ محبت کی ترقی اور پختگی کے

لئے مضر ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کی محبت کمال کو پہنچے۔ ظاہر ہے کہ یہ تقاضا انسان کی فطرت کے کسی حصے کو دبانے' یا روکنے سے پورا نہیں ہو گا بلکہ اس کے مکمل اظہار سے پورا ہو گا۔ جب درخت اگتا ہے اور نشوونما پاتا ہے تو اس کی ہر شاخ بڑھتی اور پھولتی ہے اور اگر یہ بات نہیں تو ہم کہیں گے کہ درخت کی نشوونما خاطر خواہ طریق سے نہیں ہو رہی۔ انبیاء کی دعوت کا مقصد قطعاً" یہ نہیں کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں میں سے کسی ایک کو بھی روکا جائے بلکہ اس کے بالکل برعکس اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنی فطرت کے سارے تقاضوں کو بہ تمام و کمال پورا کرنے میں مدد دی جائے کیونکہ اس کی فطرت کا ہر تقاضا اس کے سب سے بڑے تقاضے یعنی تکمیل محبت کا موید اور معاون ہے' یعنی حق تعالیٰ کی محبت کی ایک شاخ ہے۔ اگر محبت کی ہر شاخ نشوونما پا رہی ہے تو محبت کا درخت بھی نشوونما پا رہا ہے ورنہ نہیں۔ انبیاء کی تعلیم کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر انسان اپنے فطرت کے سارے تقاضوں کو بہ تمام و کمال پورا نہیں کر سکتا' لہٰذا اپنی زندگی میں ناخوش اور پریشان اور اطمینان قلب کی گراں قدر نعمت سے محروم رہتا ہے۔

انسان کی فطرت کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ وہ شادی کرتا ہے اور ایک خاندان میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مختلف رشتہ داروں سے اپنے تعلقات کی وجہ سے وہ کئی حیثیتیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ بیٹا' بھائی' باپ' خاوند' داماد یا سسر ہوتا ہے **وعلی ھذا القیاس**۔ مومن کے لئے ضروری کہ اپنی ہر حیثیت میں دوسروں سے ایسا برتاؤ کرے جو صفات جمال کے مطابق ہو ورنہ اس کی محبت نشوونما نہیں پائے گی۔ دوسروں کے ساتھ تعلقات میں صفات جمال کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی جسمانی اور روحانی تربیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے بلکہ حتی المقدور اس تربیت کی تائید اور اعانت کی جائے کیونکہ یہ تربیت خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ اپنی صفات جمال کا اظہار کرتا ہے۔ خاندانی تعلقات کی بنیاد انسان کی حیوانی جبلتوں پر ہے جو خدا کی محبت' رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہیں۔ تصور کامل کی ضرورت کے ماتحت ان جبلتوں کی اعانت کرنا اظہار جمال کی ایک مشق ہے۔ ناقص تصورات جو انسان کی حرص و ہوا اور ظلم و تعدی سے سہارا لیتے ہیں' ان جبلتوں کی صحیح تسکین و تشفی کے راستہ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ صرف مرد مومن ہی ایک ایسا انسان ہے جو ان جبلتوں کی مناسب تائید اور اعانت کر سکتا ہے اور خاندانی تعلقات کو ٹھیک طریقہ سے یعنی صفات جمال کے تقاضوں کے مطابق نبھا سکتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت یا معرفت اور بھی ترقی کرتی ہے۔

انسان کی فطرت کا ایک اہم تقاضا' جو مومن کے لئے ایک بہت بڑا میدان عمل مہیا کرتا ہے' یہ ہے کہ ایک تصور کو ماننے والے افراد اپنے تصور کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے

ہیں اور مل کر ایک جماعت بن جاتے ہیں' پھر اس جماعت میں ایک تنظیم پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جماعت کے افراد جس قدر زیادہ اپنے تصور سے محبت رکھتے ہیں' اسی قدر زیادہ ایک دوسرے سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کی محبتیں ایک دوسرے کی موید اور معاون ہوتی ہیں۔ لہٰذا جوں جوں یہ دونوں محبتیں ترقی کرتی ہیں' جماعت میں تنظیم' وحدت اور اخلاقی قوت اور اس کے افراد میں اخوت اور ہمدردی کے جذبے اور مساوات کا احساس ترقی کرتا ہے۔ یوں تو ہر تصور کے ماننے والے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں' لیکن صحیح اور کامل تصور کو ماننے والی جماعت کی صورت میں افراد جماعت کی باہمی محبت ترقی کر کے اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کیونکہ تصور کامل کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کی محبت انسان کی سفلی خواہشات پر پورا پورا غلبہ پا لیتی ہے' یہاں تک کہ پھر یہ سفلی خواہشات تصور کی محبت میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتیں اور تصور کی محبت ترقی کا راستہ کھلا پا کر کمال کو پہنچ جاتی ہے' لہٰذا پرستاران حق کی جماعت کی وحدت' تنظیم اور اخلاقی قوت اور اس کے افراد کے جذبات محبت' اخوت' ہمدردی اور مساوات بھی درجہ کمال پر ہوتے ہیں۔ اس جماعت کی وحدت یہاں تک ترقی کر جاتی ہے کہ وہ جسد واحد کی طرح ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک کا دکھ سب کا دکھ ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **المومنون کجسد واحد اذا اشتکی بعضہ اشتکی کلہ** (مومن ایک جسد واحد کی طرح ہیں کہ اس کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔)... **المسلمون کرجل واحد اذا اشتکی عینہ او راسہ اشتکی کلہ** (مسلمان ایک فرد کے مانند ہیں کہ اس کی آنکھ یا سر تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔) ماہرین علم الحیات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک جسم حیوانی بہت سے افراد کی مکمل تنظیم اور مکمل وحدت کا نام ہے۔ یہ افراد خلیات (Cells) ہیں۔ ہر خلیہ ایک خود مختار جسم حیوانی ہے جو اپنی بقاء کے لئے خوراک حاصل کرتا' زندہ رہتا' طاقتور ہوتا یا خوراک حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں کمزور ہوتا اور مرتا ہے۔ جسم کے تمام خلیات سارے جسم کی ضروریات کے مطابق علیحدہ علیحدہ فرائض انجام دیتے ہیں' لیکن سب کے سب ایک ہی مرکزی نظام کے ماتحت ہیں جسے ہم دماغ یا نظام عصبی کہتے ہیں۔

ان دنوں ہمیں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے' لیکن اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جسد واحد کی مثال پر غور کریں تو یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ جسد واحد کے اندر زندگی کی رو جو دماغ اور نظام عصبی کے ذریعہ سے تقسیم ہوتی ہے' ہر خلیہ کی پرورش کرتی اور اسے تقویت دیتی ہے۔ زندگی کی اسی رو پر جسم کی صحت' تندرستی اور طاقت کا انحصار ہے۔ جب خلیہ طاقتور ہو جاتا ہے تو اپنی فالتو طاقت کو جسم کی مرکزی قوت کے ذریعہ سے باقی

خلیات کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ گویا خلیہ کی زکوٰۃ ہے۔ اس سے دوسرے خلیات 'یعنی سارا جسم طاقت حاصل کرتا ہے۔ پھر جسم کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے ہر خلیہ اور طاقتور ہوا جاتا ہے' گویا ہر خلیہ جسم سے طاقت لیتا بھی ہے اور جسم کو طاقت دیتا بھی ہے اور جسم خلیہ سے طاقت حاصل بھی کرتا ہے اور اسے عطا بھی کرتا ہے۔ بالکل یہی حال فرد اور جماعت کا ہے۔ جماعت کے اندر زندگی کی رو' جو اسے متحد اور منظم کرتی ہے اور اسے فرد واحد کی شکل دیتی ہے' اس کے تصور حیات کی محبت ہے۔ جس جماعت کی محبت تصور کمال پر ہوگی وہ پوری طرح سے طاقتور' تندرست اور زندہ ہوگی۔ جماعت کی تنظیم کا نام حکومت ہے۔ حکومت ایک جماعتی جسد میں دماغ یا نظام عصبی کی قائم مقام ہے۔ جس طرح دماغ کے ذریعہ سے جسم حیوانی کے اعضاء میں زندگی کی رو تقسیم ہوتی ہے' اسی طرح حکومت کے ذریعہ سے افراد کی محبت کی نشوونما یعنی ان کی روحانی تعلیم اور تربیت کا انتظام ہوتا ہے۔ جب جماعت یا حکومت کی اعانت سے فرد کی روحانیت قوت حاصل کرتی ہے یا اس کی محبت ترقی کرتی ہے تو فرد اس ترقی یافتہ روحانیت یا محبت سے ساری جماعت کو حصہ دیتا ہے۔ یہ تقسیم قوت فرد کی زکوٰۃ ہے اور حکومت یا جماعت اس تقسیم قوت کا آلہ کار بنتی ہے۔ پھر جماعت اپنی ترقی یافتہ قوت کی وجہ سے اور بھی زیادہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ فرد کی روحانی تربیت کا کام موثر طریق سے انجام دے سکے۔

اگر پوچھا جائے کہ فرد جماعت کے لئے ہے یا جماعت فرد کے لئے تو بلا تردد اس کا جواب یہ ہوگا کہ جماعت فرد کے لئے ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ جب تک فرد اپنے آپ کو جماعت میں نہ کھوئے' اس وقت تک وہ ایک فرد کی حیثیت سے اپنے کمالات کو نہیں پا سکتا۔ فرد کی فطرت کے ممکنات کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ فرد جماعت میں زندگی بسر کرے اور اپنے آپ کو جماعت میں مدغم کر دے۔ جس حد تک وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے جماعت کے مفاد کی مخالفت کرے گا' اسی حد تک اس کی اپنی انفرادیت ناقص رہے گی اور وہ ایک فرد کی حیثیت سے ناپختہ اور ناتمام رہے گا' یعنی اس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت اپنے کمال کو نہیں پہنچے گی۔ یہی سبب ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں جماعتی احساس کو طاقتور کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: **علیکم بالجماعتہ من شذ شذ فی النار** (جماعت کے ساتھ رہنا تم پر لازم ہے۔ جو الگ ہوا' وہ الگ کر کے دوزخ میں ڈالا گیا۔) مومن اپنے دوسرے بھائیوں سے مل کر اور ایک مرکز اور ایک قائد کے ماتحت ایک نظام اور وحدت میں داخل ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ جب اس کا قائد کھڑا ہوتا ہے تو وہ کھڑا ہوتا ہے۔ جب وہ رکوع کرتا ہے تو وہ بھی رکوع کرتا ہے۔ جب وہ سجدے میں گرتا ہے تو وہ بھی سجدے میں گرتا ہے۔ اس نماز باجماعت سے غرض یہ ہے کہ مومن کو معلوم رہے کہ وہ

ایک فرد نہیں بلکہ ایک جماعت ہے اور یہ کہ اس کی جماعت کا مقصد بھی ایک ہے اور وہ مقصد وہی ہے جو نماز کا مقصد ہے، یعنی طلب جمال یا تکمیل محبت اور اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔ مومن کی نماز باجماعت چھوٹے پیمانے پر اس کی ساری زندگی کا ایک نقشہ ہے۔ اس کی ساری زندگی ایک قائد یا راہنما کے ماتحت گویا ایک نماز باجماعت ہے۔ اسی لئے نماز باجماعت کی ہدایت خود قرآن میں ہے: **وارکعوا مع الراکعین** (رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔)

چونکہ مومن اپنے آپ کو ایک جماعت سمجھتا ہے اس لئے وہ اپنی دعاؤں میں بھی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔۔ **ربنا اتنافی الدنیا حسنتہ و فی الاخرۃ حسنتہ وقناعذاب النار** (اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی۔ اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔)

نماز باجماعت، حج، زکوٰۃ اور روزہ مومن کی جماعتی زندگی کے قیام اور اس کی اخوت کی پرورش کے ذرائع ہیں۔ جماعت میں کھو جانے سے فرد اپنے آپ کو پاتا ہے اور اس کی محبت ترقی کرتی ہے۔ اس کی ترقی یافتہ محبت کی وجہ سے جماعت اور بھی زیادہ منظم اور متحد ہو جاتی ہے۔

ان حقائق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ بہت سے مختلف خلیات کو ایک نظام عصبی کے ماتحت متحد اور منظم کر کے ایک جسد واحد بنا دیتا ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ تمام نوع بشر کے افراد کی باہمی محبت اور اخوت بھی یہاں تک ترقی کرے کہ وہ سب ایک ہی حکومت کے ماتحت متحد اور منظم ہو کر ایک جسد واحد بن جائیں۔ اس نے سب انسانوں کے لئے ایک ہی فطرتی نظریہ زندگی مقرر کیا ہے تاکہ اختلافات کی بنیاد ہی باقی نہ رہے۔ نوع بشر کے باہمی اختلافات کی وجہ نظریات زندگی کی رنگا رنگی ہے۔ خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ نظریہ توحید کی بنیاد پر ایک ایسی ریاست وجود میں آئے جو فرد واحد کی طرح متحد و منظم ہو اور جدوجہد کر کے تمام دنیا پر پھیل جائے اور پھر ساری نوع انسانی کو اس طرح متحد و منظم کرے کہ وہ ایک فرد واحد کی طرح ہو جائیں۔ انسان کی غیر مبدل فطرت کے تقاضے نہ صرف خدا کے اس منشاء کا پتہ دے رہے ہیں بلکہ اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ منشاء پورا ہو کر رہے گا۔ ہر بیج سے وہی درخت اگتا ہے جو اس کی فطرت میں موجود ہو۔ پھر قرآن کی اس پیش گوئی سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے: **ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ الکافرون** (اور وہی ذات خداوندی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت کے ساتھ بھیجا تاکہ ہر دین پر اسے ظاہر کردے اگرچہ کافروں کو ناپسند ہی ہو۔)

جماعت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے فرد کو کس حد تک اپنے مفاد کی قربانی کرنی چاہئے، اس کا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ امراء

تمہیں نماز پڑھاتے ہیں۔ اگر انہوں نے نماز' غلط طریق سے پڑھائی تو اس کا بوجھ ان کی گردن پر ہو گا۔ لیکن تمہیں ہر حالت میں ان کی اطاعت کرنی چاہئے۔ گویا اطاعت میں رہ کر اور جماعت کی وحدت اور تنظیم کو برقرار رکھتے ہوئے اگر فرد نماز جیسے ایک مقدس فرض کی ادائیگی میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو جائز ہے لیکن اگر اپنے آپ کو اور دوسروں کو درست کرنے کی خاطر' جماعت میں افتراق پیدا کرتا ہے تو خطا کار ہے اور اس قابل ہے کہ آگ میں جھونکا جائے کیونکہ اس طرح اس نے خدا کی اطاعت و عبادت سے انحراف کیا ہے۔ فرد کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محبت کی حفاظت اور تربیت کی خاطر جماعت کو برقرار رکھے۔ اگر جماعت نہیں تو وہ بھی نہیں۔ جب ایک فرد واحد غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے اعضاء و جوارح اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح فرد کی وحدت قائم رہتی ہے اور وہ اس قابل ہوتا ہے کہ جب اپنی غلطی کا احساس کرے تو اس سے واپس آئے اور اس کی تلافی کرے۔ لیکن اگر اس کے اعضاء و جوارح اس سے کٹ کر الگ ہو جائیں کہ ہم غلطی پر تعاون نہیں کریں گے تو فرد کی وحدت اور لہٰذا اس کی ترقی ختم ہو جائے گی' نہ صرف یہ کہ پھر وہ اس غلطی کی تلافی نہیں کر سکے گا بلکہ آئندہ کے لئے اپنے مدعا کے حصول کے لئے کوئی کامیاب جدوجہد نہیں کر سکے گا۔ ہماری صحیح فطرت یہ ہے کہ ہم جماعت میں رہیں۔ جس طرح فرد کبھی غلطی پر ہوتا ہے اور کبھی راستی پر' لیکن مجموعی طور پر اپنے تصور کی طرف بڑھتا رہتا ہے' اسی طرح جماعت کبھی غلطی پر ہوتی ہے اور کبھی راستی پر' لیکن مجموعی طور پر اپنے تصور کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

اوپر میں نے عرض کیا ہے کہ فرد اور جماعت یا ریاست دونوں کا مقصد فرد کی روحانی تربیت ہے اور میں نے فرد کی جسمانی تربیت کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن روحانی تربیت میں جسمانی تربیت بھی شامل ہے۔ جسم کی تربیت کے بغیر' محبت کی تربیت ممکن نہیں۔ اس زمانے میں جب اشتراکیت کے پروپیگنڈے نے روٹی کے مسئلے کو حد سے زیادہ اہمیت دی ہے' اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مومن کے نزدیک جسم کی تربیت بذات خود کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں رکھتی اور فقط محبت کی تربیت کا ذریعہ ہے کیونکہ جسم کے قیام اور بقاء کے بغیر فرد اور جماعت دونوں کے لئے ممکن نہیں کہ محبت کی ترقی کے لئے عمل کے میدان میں جدوجہد کر سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كاد الفقران يكون كفرا (عین ممکن ہے تنگدستی انسان کو کفر تک لے جائے۔)

ایک منظم جماعت یا ریاست کے افراد کی باہمی محبت جو جماعت یا ریاست کے قیام' بقاء اور ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے' انسان کی فطرت کے تین عناصر سے قوت حاصل کرتی ہے۔ اول' جماعت میں رہنے کی وہ جبلتی خواہش جسے ہرڈ انسٹنکٹ (Herd Instinct) کا نام دیا گیا ہے اور جو حیوان

اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ اس جبلتی خواہش کی وجہ سے انسان مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے۔ دوم' تصور کی محبت جس کی وجہ سے ایک انسان تمام ایسے انسانوں سے کشش' میل جول اور اتحاد کی خواہش رکھتا ہے جو اس کے اپنے تصور کو مانتے ہوں۔ سوم' انسان کی محبت انسان کے لئے جس کی وجہ سے ایک انسان تمام دوسرے انسانوں سے' خواہ وہ کسی بھی تصور کے ماننے والے ہوں اور کسی بھی مذہب' ملت' قوم' وطن یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں' ایک فطرتی کشش رکھتا ہے۔ یہ آخری قسم کی محبت جبلتی سطح کی خواہش نہیں بلکہ انسانی اور نفسیاتی سطح کی خواہش ہے اور جستجوئے جمال کے فطرتی جذبے کا ایک حصہ ہے۔ صرف ایک مرد مومن ہی ہے جس کا تصور ان تینوں قسم کی خواہشات کو پوری طرح سے اظہار پانے کا موقع دیتا ہے۔ جہاں تک پہلی جبلتی خواہش کا تعلق ہے' مومن جماعت کو خدا کی رحمت اور ربوبیت کا نشان سمجھ کر بحد جواز اس کی اعانت کرتا ہے۔ اور دوسری خواہش کے سلسلہ میں یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ کیونکہ صرف مرد مومن کی محبت تصور ہی ایسی ہے جو کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ تیسری خواہش چونکہ خدا کی محبت کا ایک حصہ ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ اس کی پوری تشفی مرد مومن ہی سے ہو سکے گی۔ مومن جس طرح دوسرے انسانوں سے محبت کر سکتا ہے' کافر نہیں کر سکتا کیونکہ مومن جانتا ہے کہ تمام انسان اس کے محبوب اور معبود کے پیدا کئے ہوئے بندے ہیں اور ان کا پیدا کرنے والا ان سے محبت رکھتا ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے اس نے ان کی ہدایت اور روحانی تربیت کا یہ انتظام کیا ہے کہ انبیاء کو بھیجا ہے اور پھر خود اس کو بھی ان کی ہدایت اور تربیت کے لئے مامور کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: **اللھم اشھد انک انت اللہ لاالہ الا انت ان العباد کلھم اخوۃ** (اے اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اللہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں' اور تمام بندے بھائی بھائی ہیں۔) خدا کے بندوں سے محبت کرنا خود خدا سے محبت کرنا ہے۔

گو مومن کافر سے بحیثیت ایک انسان کے محبت کرتا ہے لیکن کافر کے تصورات سے محبت نہیں کرتا بلکہ ان سے انتہائی نفرت کرتا ہے یہاں تک کہ ان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس کی یہ نفرت درحقیقت خدا اور انسان کی محبت ہی کا ایک پہلو ہے۔ مومن جس قدر حق سے زیادہ محبت رکھتا ہے' اسی قدر باطل سے زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اس کی یہ نفرت اس کی صفات جلال یعنی اس کے قہر اور غصہ اور حمیت اور غیرت کی آئینہ دار ہے اور اسی کی وجہ سے مومن غلط تصورات کو مٹا کر نوع بشر کو کامل اور صحیح تصور کی محبت سے مالا مال کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اس نفرت کی وجہ سے وہ کافر کے ساتھ جنگ کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے تاکہ حق کے راستے سے غلط تصورات کی رکاوٹ اور مزاحمت کو ہٹا دے۔ اس طرح اس کی نفرت انسانیت کے لئے خدا کی محبت' رحمت

اور ربوبیت کا مظہر بنتی ہے۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاسجدا یبتغون فضلا" من اللہ ورضوانا (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور باہم رحم دل ہیں۔ تو انہیں رکوع و سجود کرتے دیکھے گا۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔)... اذلتہ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ لایخافون لومتہ لائم (اہل ایمان مومنوں کے لئے نرم اور کافروں کے لئے سخت ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی کے برا بھلا کہنے سے نہیں ڈرتے۔)

مومن کافر سے اسی حد تک اخوت، محبت، میل ملاقات اور تعاون کا اظہار کرتا ہے جس حد تک کہ اس کا تعاون کافر کے باطل تصور کے محارب اور جلالی پہلو کے لئے باعث تقویت نہ بنے۔ لایتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین (مومن، کافروں کو دوست نہ بنائیں، مومنوں کو چھوڑ کر۔)

تصورات حیات کی باہمی کشمکش اور جنگ و جدال، جو کبھی خون ریز ہوتی ہے اور کبھی پر امن لیکن ہر وقت جاری رہتی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ آخر کار ایک ہی تصور حیات تمام تصورات پر غالب آئے گا اور دنیا پر چھا جائے گا۔ یہی وہ تصور ہو گا جو دنیا میں دائمی امن و امان قائم کرے گا اور جس کی وجہ سے جنگوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ یقیناً یہ تصور توحید ہی کا تصور ہو سکتا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے پائیدار اور مستحکم ہے۔ غلط نظریات زندگی میں سے اگر کوئی نظریہ کسی وقت دنیا پر چھا بھی جائے تو اس کا غلبہ عارضی ہو گا، اس کی مزاحمت خود اس کے ماننے والوں کی فطرت کے اندر سے پیدا ہو گی یہاں تک کہ وہ خود اس کو موت کی نیند سلا دیں گے۔ تصورات کی باہمی کشمکش میں پرستاران حق کو بھی شریک ہونا پڑے گا کیونکہ باطل کی دعوت مبارزت پر لبیک کہنا مومنوں کی صفات جلال کا تقاضا ہے اور وہ اس تقاضے کو پورا کریں گے۔ ان کا جہاد حق کی آخری کامیابی کا ذریعہ ہو گا۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغہ فاذا ھوزا ھق (بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور وہ اس کا سر کچل دیتا ہے اور یوں باطل مٹ کے رہتا ہے---) حق علینا نصرالمومنین (مومنوں کی مدد ہم پر واجب ہے۔) پرستاران حق کے تصور کی نوعیت ہی ان کی آخری کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس تصور کا ظہور باطل کے لئے موت کا پیغام ہے--- قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" (کہو حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے۔)

عقیدہ توحید کی اس تشریح سے ظاہر ہو تا کہ اسلام کے دو پہلو ہیں: ایک عقائد اور دوسرا اعمال، ایک نظریہ زندگی اور دوسرا اس نظریہ کے مطابق عمل۔ ہر عقیدہ عمل میں منتقل ہوتا ہے اور ہر عمل

سے پہلے ایک عقیدہ موجود ہوتا ہے۔ ہر عمل کی نوعیت اس کے پیش رو عقیدہ کی نوعیت پر موقوف ہوتی ہے۔ غلط عقائد سے غلط اعمال پیدا ہوتے ہیں اور صحیح عقائد سے صحیح اعمال۔ اگر ہم چاہیں کہ کسی قوم کا عمل اچھا ہو جائے تو ہمیں صرف اس کا عقیدہ درست کرنے کی ضرورت ہے' پھر عمل خود بخود پیدا ہو گا۔ لہٰذا جو چیز اسلام کی روح' مغز یا اصل یا بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے' وہ اسلام کے عقائد ہی ہیں۔ عقائد ہی کو قرآن مجید نے ام الکتاب یعنی قرآن کی ماں کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر اسلامی عقائد فطرت انسانی کے لازوال قوانین پر مشتمل ہیں' اس لئے عقائد کو آیات محکمات بھی کہا گیا ہے' یعنی پختہ نشانات صفات--- **ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ ایات محکمات ھن ام الکتاب**۔ (وہی ہے جس نے تم پر کتاب کو نازل کیا' اس میں محکم آیات ہیں اور وہ ام الکتاب ہیں۔) پھر چونکہ یہ عقائد پختہ اور محکم قوانین فطرت ہیں ان کے مطابق عمل کرنے کو دین قیم کہا گیا ہے--- **اقم وجھک للدین حنیفا" فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم** (اپنا رخ دین حنیف کی طرف رکھو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہی دین قیم ہے۔) ظاہر ہے کہ انسان کائنات کا ایک اہم ترین جزو ہے لہٰذا فطرت انسانی کے قوانین ساری کائنات کے قوانین سے الگ نہیں ہو سکتے۔ فطرت انسانی کا نظریہ ساری کائنات کا نظریہ ہے۔ کائنات میں بھی وہی صفات جمال ظہور پذیر ہوئی ہیں جن کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ فطرت انسانی سر کائنات ہے--- **قل انزلہ الذی یعلم السر فی السموات والارض** (کہو اسے اتارا ہے اس ذات نے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتی ہے۔)

فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے نظریہ یعنی اسلامی عقائد یا اسلامی نظریہ حیات کے اہم ترین نکات' جو قدرت کے غیر مبدل قوانین پر مشتمل ہیں' حسب ذیل ہیں:

(۱) انسان اور کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئے بلکہ ان کا ایک خالق ہے۔

(۲) وہ خالق حی و قیوم ہے' رحمان اور رب اور رحیم و کریم ہے' سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے' شکور اور ودود' قہار اور جبار ہے' غرضیکہ تمام صفات جمال و جلال کا مالک ہے۔

(۳) خالق کائنات نے انسان کے دل میں اپنی اور اپنی صفات جمال کی محبت کا ایک نہایت ہی شدید اور طاقتور جذبہ رکھ دیا ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے۔

(۴) جب تک انسان اس فطرتی جذبہ کا صحیح اور کامل اظہار نہ کرے وہ بے اطمینان اور بے قرار رہتا ہے۔

(۵) محبت کا یہ جذبہ ایسا نہیں کہ اسے روکا جا سکے۔ لہٰذا جب انسان اس جذبہ کے صحیح اور

کامل اظہار کا طریقہ نہ جانتا ہو تو وہ مجبوراً غلط طریق سے اس کا اظہار کرتا ہے' یعنی کسی ایسے معبود کو اپنا لیتا ہے جو صفات جمال تو نہیں رکھتا لیکن جس کی طرف وہ ناحق طور پر صفات جمال منسوب کر دیتا ہے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی خواہش اسے غلطی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

(۶) انسان موت سے فنا نہیں ہوتا بلکہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جہاں انسان اپنی محبت کے اس حصہ کی تکمیل کرتا ہے جو اس دنیا میں تکمیل پانے سے رہ گیا ہو۔

(۷) غلط معبود کی پرستش اور عبادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کی ساری سرگرمیاں غلط راستہ اختیار کرتی ہیں اور اس کی فطرتی محبت کی تکمیل کے لئے فائدہ نہیں دیتیں۔ موت کے بعد اسے اپنے غلط عمل کے اس سارے راستہ پر واپس آنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی غلط محبت سے نجات پا کر صحیح محبت کی ابتداء کرے اور اسے انتہا تک پہنچائے۔ اس غرض کے لئے اسے دوزخ کی سختیوں کو جھیلنا پڑتا ہے جہاں وہ اپنے غلط اعمال کی سزا بھگت کر پاک ہوتا ہے۔

(۸) چونکہ غلط معبود بہت سے ہو سکتے ہیں' اس لئے جو لوگ اپنے فطرتی جذبہ محبت کی صحیح راہ نمائی نہیں پاتے' وہ مختلف معبودوں کے ماتحت مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے نوع انسانی میں افتراق پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں جنگ و جدال کی آگ بھڑکتی رہتی ہے--- **ان الذین تفرقوا دینھم و کانوا شیعاً" لیست منھم فی شی** (جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ کیا اور گروہوں میں بٹ گئے' ان کے لئے یہ فرقہ بندی ہرگز سودمند نہیں۔)

(۹) چونکہ انسان کے فطرتی جذبہ محبت کا بھٹکنا اس کے لئے حد درجہ خطرناک تھا' لہٰذا قدرت نے جس طرح انسان کی اور ضروریات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا ہے اسی طرح اس کے اس جذبہ کی راہنمائی بھی اپنے ذمہ لی ہے اور اس غرض کے لئے اپنا انتظام کیا ہے جسے نبوت کہتے ہیں۔

(۱۰) انسان کے فطرتی جذبہ محبت کے صحیح اور مکمل اظہار کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب وہ خدا اور اس کی صفات جمال پر ایمان لاتا ہے۔ ایمان لانے سے اس کے دل میں جمال حقیقی کا فطرتی احساس بیدار ہوتا ہے۔

(۱۱) احساس حسن یا ایمان عمل یا عبادت میں اپنا اظہار چاہتا ہے۔

(۱۲) عبادت یا عمل کے دو پہلو ہیں' ایک مطالعہ جمال اور دوسرا اظہار جمال' دونوں مل کر

مومن کی محبت کو کمال تک پہنچاتے ہیں۔

(۱۳) مطالعہ جمال صفات حسن پر غور و فکر کرنے کا نام ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان مظاہر قدرت پر غور و فکر کر کے ان میں صفات جمال کا مشاہدہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ نہایت اخلاص کے ساتھ اور دل کی پوری توجہ سے اسمائے حسنیٰ کا ذکر کرے اور باقاعدگی کے ساتھ خدا کی حمد و ستائش اور تسبیح و تقدیس کو اپنا شعار بنائے۔ مطالعہ جمال کے یہ دونوں طریقے محبت کی ترقی اور تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔

(۱۴) اظہار جمال اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے یعنی اپنی اخلاقی زندگی میں صفات جمال کو ملحوظ رکھنے کا نام ہے۔

(۱۵) انسان کی اخلاقی زندگی کے مختلف شعبے ہیں: (ا) اپنے آپ کے ساتھ برتاؤ (ب) خویش واقربا کے ساتھ برتاؤ (ج) اپنی جماعت کے ساتھ برتاؤ (د) اپنی جماعت سے باہر غیر لوگوں سے برتاؤ۔ جب مومن اپنی ذات اور خلقت کے ساتھ اپنے برتاؤ میں صفات جمال کا اظہار کرتا ہے تو اس کی محبت ترقی کرتی ہے۔ سیاسی آزادی کا حصول اور قیام' تبلیغ دین' نماز باجماعت' روزہ' زکوٰۃ اور جہاد عمل کے وہ طریقے ہیں جو فرد کو مدد دیتے ہیں کہ وہ ان تعلقات کو صفات ربانی کے تقاضوں کے مطابق نبھائے۔ ان میں سے ہر چیز عبادت بھی ہے اور عبادت کی مشق اور تیاری بھی ہے۔

(۱۶) سیاسی آزادی کے بغیر عمل کی آزادی' اور لہٰذا محبت کی پوری پوری نشوونما ممکن نہیں۔

(۱۷) نبوت کی ہدایت کو قبول کرنے سے انسان اس دنیا میں اطمینان' امن' اتحاد اور صلح کی زندگی پا سکتا ہے اور پھر چونکہ ہدایت نبوت قبول کرنے سے اس دنیا میں اس کی محبت اس کی استعداد کے مطابق درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے لہٰذا اگلی دنیا میں بھی اس کی ترقی بلاخوف و خطر جاری رہتی ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے فطرت انسانی کے اس نظریہ کی تعلیم دی ہے لیکن ان میں سے کسی پیغمبر کو ایسے حالات پیش نہیں آئے کہ ان کی اصلاح کرتے ہوئے وہ فطرت انسانی کے تمام ضروری پہلوؤں کو بے نقاب کر سکتا۔ ہر پیغمبر کے زمانہ کا اقتضا ایسا ہی تھا۔ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کی خاص تمدنی اور اخلاقی حالت کے پیش نظر اپنی تعلیم میں فطرت انسانی کے خاص پہلوؤں پر زور دیا اور بعض خاص پہلوؤں کو' جن کی تعلیم کی ضرورت اس کی قوم کو نہیں تھی یا جن کی تعلیم سے اس کی قوم اپنی ارتقائی منزل یا اپنی تمدنی حالت کے پیش نظر مستفید نہیں ہو سکتی تھی' نظرانداز کر دیا۔ یہی

وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کی تعلیم اس کی اپنی قوم اور اپنے زمانہ کے کام آئی اور بعد میں اس کے خط و خال مسخ ہو گئے اور وہ عملی طور پر مٹ گئی۔ خالق کائنات کی حکمت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ سلم کو ایسے تمدنی' سیاسی' اخلاقی اور جغرافیائی حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے آپؐ کی نظری تعلیم اور آپ کی عملی زندگی کی مثال میں فطرت انسانی کے تمام پہلو بے نقاب ہو گئے اور آپؐ کی تعلیم اور عملی زندگی کا پورا پورا اور قابل اعتماد ریکارڈ بھی تاریخ میں ضبط رہ گیا۔۔۔ بحکم ارشاد **انانحن نزلنا الذکر وانالہ لحافظون** (ہم نے یہ ذکر یعنی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔) نبوت آپؐ پر ختم ہو گئی۔ آپؐ کے ظہور پر نوع بشر کو بشارت دی گئی: **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**" (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا۔) حضورؐ نے تمام انبیاء سے آگے جا کر انسان کی فطرت کے تمام اہم تقاضوں کو نہ صرف اپنی تعلیم سے بلکہ اپنی عملی زندگی کی مثال سے آشکار کیا' مثلاً انسان کی خاندانی' سیاسی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں حضورؐ کے سوا کسی اور نبی کی تعلیم میں کوئی مفصل راہنمائی نہیں ملتی' حالانکہ انسان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی اس کی ساری اخلاقی زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ آپؐ نے شادیاں کیں۔ اپنے گروہ کو ایسے دشمنوں کے مقابلے کے لئے تیار کیا جو آپؐ کے پیغام کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ایک ریاست بنائی اور اس کا انتظام کیا۔ اس کے اندر اور باہر غیر مسلموں سے خاص نوعیت کے تعلقات قائم کئے' فوجوں کی قیادت کی اور دشمن علاقوں کو فتح کیا۔ ہر تصور حیات کو اپنی کامیابی کے لئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور اس قسم کے حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ ضرورت تھی کہ بتایا جائے کہ تصور کامل کے پرستاران حالات کا سامنا کس طرح کرتے ہیں۔ یہ ضرورت صرف آپؐ کی تعلیم اور مثال سے پوری ہوتی ہے۔

ایک کامل نبی پر نبوت کا اختتام وحدت خدا اور وحدت انسانیت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اگر انبیاء کا سلسلہ تا قیامت جاری رہتا تو اس بات کی امید کبھی نہ ہو سکتی کہ کسی وقت نوع انسانی ایک کامل نبی کی روحانی قیادت میں ایک کامل تصور حیات پر متحد ہو جائے گی۔

رسولؐ کی موبہ مواطاعت کے بغیر ہماری محبت ترقی نہیں کر سکتی۔ جس طرح ایک دیے سے دیا جلتا ہے اسی طرح رسولؐ کا پیرو رسولؐ کی محبت سے اپنے دلوں کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو رسولؐ کی اطاعت میں دے دیتا ہے وہ گویا ایک جنم لیتا ہے۔ یہ جنم اس کی محبت کا جنم ہے جس کے بعد اس کی محبت رسولؐ کے علم سے تربیت پا کر اس طرح ترقی کرتی ہے جس طرح ایک نومولود بچہ ماں کے دودھ سے تربیت پا کر جسمانی نشوونما حاصل کرتا ہے۔ ارتقاء کی حیاتیاتی

(Biological) سطح پر زندگی نسلی توالد کے ذریعہ سے بڑھتی اور پھیلتی ہے' یعنی حیوانات کی ایک قسم کے سارے افراد ایک باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس توالد میں قدرت متضاد جنسوں (Opposite Sexes) کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے۔ ارتقاء کی نفسیاتی (Psychological) سطح پر زندگی کے بڑھنے اور پھیلنے کا طریقہ ایک قسم کا نفسیاتی توالد ہے جس کے نتیجے کے طور پر ایک نصب العین کو ماننے والے اپنے نصب العین کی محبت ایک ہی روحانی باپ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس توالد میں قدرت تابع اور متبوع کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے۔ جس طرح ایک جاندار وجود اپنی طرح کے دوسرے جاندار وجود کو پیدا کرتا ہے اسی طرح ایک تصور اپنی طرح کے دوسرے تصور کو پیدا کرتا ہے' یعنی ایک انسان کا تصور دوسرے انسان کا تصور بن جاتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور محبت یا علم سے بہرہ ور ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم رسولؐ کی ذات پر اس طرح انحصار کریں جس طرح ایک جنین اپنی نشوونما کے لئے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے۔ فقط اسی صورت میں ہم اپنی محبت کا وہ جنم پا سکتے ہیں جس کے بعد محبت کا ارتقاء شروع ہوتا ہے۔ پھر رسولؐ کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری محبت کے ارتقاء کا ایک ایسا دور بھی آئے گا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے محبت کے اس نقطہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسولؐ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہوگی جو بیٹے کو شکل و صورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے کیونکہ ہمیں رسولؐ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہو گا۔ قرآن میں بارہا آل و اولاد کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی تصور کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجہ حرارت رکھنے والے جسم سے گذر کر کم درجہ حرارت رکھنے والے اجسام میں جو اس سے چھوتے ہیں' سرایت کرتی ہے یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہ کر ان مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں' اسی طرح محبت یا روحانیت کی لہر اس مقام سے گذر کر جہاں وہ سب سے زیادہ بلندی پر ہوتی ہے' نوع انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ علم یا محبت کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد پھیلتا ہے۔ خاتم النبیینؐ کی ذات عالم انسانی میں محبت کا بلند ترین مقام ہے جہاں محبت کا پانی فراہم ہوا ہے تاکہ نوع انسانی کی پیاس بجھائے۔ اگر ہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسولؐ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں۔

اپیل

امتِ مسلمہ کے زوال کا سبب بالعموم یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا، لیکن اس بات پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے کہ اس بے عملی کا سبب آخر کیا ہے؟

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نزدیک مسلمانوں کی بے عملی در حقیقت ہمارے یقین و اعتقاد کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ مغربی علوم کے وہ غلط نظریات اور فلسفیانہ تصوّرات ہیں جن کا اثر فضا میں چاروں طرف پھیل گیا ہے اور جن سے ہمارے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقات یکساں طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ انہی تصوّرات و نظریات نے ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کر کے اسلام کی محبّت ہم سے چھین لی ہے اور ہم عمل سے محروم ہو گئے ہیں۔

لہٰذا نئی نسلوں کے سامنے اسلام کو دورِ حاضر کی علمی زبان میں اس طرح پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ مخالفِ اسلام نظریات اور تصوّرات کی بیخ کنی کی جا سکے اور قرآن کی جن صداقتوں کی جدید فلسفہ و سائنس تائید کرتے ہیں اُنہیں اسلام کی تشریح و تعبیر کے لیے کام میں لایا جائے۔

ہمارا ادارہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے جو مخیّر حضرات اس نیک کام میں حصّہ لینا چاہیں وہ اپنے صدقات و اعانات مندرجہ ذیل پتے پر بھیجیں:

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

۷۔ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹل کوڈ ۵۴۵۰۰ - فون نمبر ۴۱۷۶۵۶